مونوگراف

رام لعل: حیات و فن

مظہر محمود

مونوگراف

رام لعل: حیات و فن

مظہر محمود

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9 انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2016
تعداد	:	550
قیمت	:	-/105 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1868

Ramlal Hayat O Fun

By: Mazhar Mehmood

ISBN :978-93-5160-100-5

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746

فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسارا پرنٹنگ سسٹمس، C-7/5 لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

ہمارا دور بھی عجیب ہے ایک طرف جہاں اردو زبان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے تو دوسری جانب دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ جدید تکنیکی انقلاب نے معلومات کے سمندر کو کوزے میں سمیٹ کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے ایسے میں اس خوف کا دامنگیر ہونا خلاف واقعہ نہیں کہ ہمارا قدیم و کلاسیکی ادب اس تکنیکی طلاطم کا شکار نہ ہو جائے۔

اپنے نابغہ ادیبوں و شاعروں پر مونوگراف لکھوانے کے اس نئے سلسلے کا آغاز اسی لیے کیا گیا ہے تا کہ ہم نئی نسل کے سامنے کم سے کم صفحات میں معروف ادبا کا سوانحی خاکہ بھی پیش کر سکیں اور ان کی تحریروں کے منتخب نمونے بھی۔

قومی کونسل نے اس سلسلے میں موجودہ اہم اردو قلمکاروں کی خدمات حاصل کی ہیں اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم قارئین کو براہ راست اپنے اس تجربے میں شامل کریں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اہم ادیبوں پر مونوگراف شائع کر دیں اور یہ بھی کوشش ہے کہ یہ مونوگراف معلومات کا ذخیرہ بھی ہو، اب اس معیار کو ہم کس حد تک حاصل کر سکے اس کا فیصلہ آپ کریں گے لیکن آپ سے یہ گزارش ضرور ہے کہ اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں ضرور نوازیں تا کہ ہم آئندہ ان مشوروں کو نشانِ منزل بنا سکیں۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

فہرست

	ابتدائیہ	vii
1	رام لعل: کوائفِ زندگی	1
2	ادبی زندگی کا آغاز	23
3	فنی ارتقا	37
4	تقسیمِ ہند سے پیدا شدہ حالات اور رام لعل کے افسانے	57
5	رام لعل کے سفرنامے	67
6	ادبی مقام	89
7	**رام لعل کی منتخب کہانیاں:**	109
i	ایک ہزار بچوں والی ماں	111
ii	ایک شہر ایک بدن	117
iii	گزرتے لمحوں کی چاپ	131
iv	ہسٹری شیٹر	147
v	مڈنائٹ سن	155

vi	نئی دھرتی پرانے گیت	167
vii	نصیب جلی	179
viii	زہر تھوڑا سا	187
ix	او۔سی	195

ابتدائیہ

میانوالی ملتان میں پیدا ہونے والے رام لعل چھابڑا ولد لچھمن داس چھابڑا کی مادری زبان سرائیکی تھی، جسے اس علاقے کی مقامی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ ان کے پورے خاندان میں کوئی شاعر و ادیب یا فن کار نہیں تھا لیکن اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد رام لعل نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے اردو زبان میں افسانے لکھنے شروع کیے تو دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کی اس بڑی اور زندہ زبان کے مشہور اور مقبول افسانہ نگار بن گئے۔ ان کی تخلیقی عمر پچاس سال سے کچھ سوا تھی۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے علاوہ ان کے افسانے پڑھنے اور پسند کرنے والے دنیا کے اُن تمام ممالک میں موجود ہیں جن میں اردو پڑھنے اور لکھنے والے رہتے بستے ہیں۔

رام لعل نے افسانوں کے علاوہ ناول بھی لکھے اور سفرنامے بھی، تنقیدی مضامین لکھے اور خاکے بھی، ریڈیو ڈرامے بھی لکھے اور ادبی و ذاتی ڈائری بھی۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ ذاتی تسکین یا ادب برائے ادب کے نظریے کے تحت نہیں۔ بلکہ اپنے ملک کے عوام کے لیے لکھا اور ان ہی کے بارے میں لکھا۔ وہ ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ رہے۔ جدیدیتی میلان سے بھی متاثر رہے لیکن بے معنویت کی طرف کبھی گامزن نہیں ہوئے۔ ان کی ساری تخلیقات برصغیر کے رہنے بسنے والے کروڑوں لوگوں کی زندگی اور ان کے تجرباتِ زندگی سے مملو ہونے کے

باعث اپنی گہری معنویت رکھتی ہیں۔

راقم الحروف نے جب یونین پبلک سروس کمیشن سے سلیکشن کے بعد لکھنؤ دوردرشن کیندر میں پروگرام ایگزیکیوٹیو کی حیثیت سے اپنی ملازمت جوائن کی، اس دوران اودھ کی جن سرکردہ شخصیات سے نیاز حاصل ہوا اُن میں رام لعل بھی تھے جن کے نام اور نگارشات سے مجھے پہلے سے بھی واقفیت تھی۔ رام لعل اس وقت تک اپنی ریلوے کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ میں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ رام لعل لکھنؤ کے ادبی اور تہذیبی حلقوں میں اپنی واضح شناخت رکھتے تھے اور تخلیقی میدان میں سرگرم عمل تھے جس کا دائرہ برصغیر ہندو پاک کے علاوہ دنیا کے ان کئی ممالک تک پہنچتا ہے جہاں اردو قارئین موجود تھے۔ لکھنؤ میں اپنے نو دس سالہ قیام کے دوران رام لعل سے میری بڑی قربت رہی۔ میں نے انھیں ہمیشہ ایک مخلص، دردمند، بے ریا، غیر متعصب، انسان دوست، اردو زبان وادب کا شیدائی اور باعمل انسان پایا۔ افسوس کہ میں ان کے آخری وقت میں لکھنؤ میں نہیں تھا۔ لیکن رام لعل کی جگہ ہمیشہ میرے دل میں رہی۔ زیرِ نظر کتاب اُن کے حضور میرا نذرانۂ خلوص ہے۔

مظہر محمود

رام لعل: کوائفِ زندگی

رام لعل کا شمار اُردو کے ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے افسانہ نگاری کا آغاز تو آزادیٔ ہند سے قبل کر دیا تھا لیکن انھیں شہرت اور مقبولیت آزادی کے کئی برسوں بعد ملی۔ پریم چند کے بعد اردو ادب میں اپنی مخصوص شناخت کی بنیاد پر بے پناہ شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے والے رام لعل کے ہمعصر جنھیں بہ لحاظِ عمر ان کے قریبی پیش روؤں میں شمار کیا جا سکتا ہے سعادت حسن منٹو، کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، غلام عباس اور ممتاز مفتی وغیرہ ہیں۔ اُن کے بعد ابھرنے والی نسل کے افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، جوگیندر پال، رام لعل اور جیلانی بانو وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ ان تمام افسانہ نگاروں کی اپنی انفرادیت اور خصوصیت ہے۔

رام لعل کا پورا نام رام لعل چھابڑا تھا۔ ان کی ولادت 3 مارچ 1923 کو غیر منقسم ہندوستان کے ایک نسبتاً غیر معروف مقام میانوالی میں ہوئی جو بہ لحاظِ زبان دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، لاہور، پٹنہ یا بھوپال وغیرہ کی طرح اردو کا مرکز نہیں تھا۔ اس علاقے کی زبان پنجابی بھی نہیں تھی۔ بلکہ پنجابی زبان سے قربت رکھنے والی ایک اور زبان تھی جسے سرائیکی زبان کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ اسے ملتانی بھی کہتے ہیں۔ دراصل سرائیکی ایک باقاعدہ زبان نہیں بلکہ بولی کا درجہ رکھتی

ہے جو میانوالی ملتان، ڈیرہ غازی خان، بہاول پور، سرگودھا، ڈیرہ اسماعیل خان اور جھنگ وغیرہ جیسے اضلاع میں عام طور پر مستعمل ہوتی رہی تھی اور اب بھی ان علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ بعض لوگ اپنی آسانی کے لیے اسے ہر ائیکی کے بجائے ملتانی نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ اس زبان کے سب سے بڑے اور اہم شاعر بابا فرید مانے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ بابا فرید کے کلام کا ایک بڑا حصہ سکھوں کی مقدس مذہبی کتاب گرو گرنتھ صاحب میں بھی شامل ہے۔

میانوالی مغربی پنجاب میں دریائے سندھ کے کنارے آباد ہے لیکن دریائے سندھ کے کنارے بسنے والے اس مقام کی آبادی لب دریا سے دو تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میانوالی کے قدیم باشندوں نے غالباً اس وجہ سے فاصلہ برقرار رکھا کہ دریائے سندھ میں اکثر سیلاب بھی آتے رہتے تھے۔ ایسی صورت میں میانوالی کی آبادی کو دریائے سندھ کی طغیانی اور سیلاب کی وجہ سے آئے دن آفتوں اور مصیبتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ سیلاب ان کے جھونپڑوں اور مکانات کو گزند نہ پہنچائے۔ آدمیوں اور جانوروں کو بہا کر نہ لے جائے۔

مغربی پنجاب کا وہ علاقہ جس میں رام لعل کی ولادت ہوئی، اپنی مخصوص جغرافیائی اہمیت کے ساتھ ساتھ تاریخی اور ثقافتی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کی چار مقدس مذہبی کتابوں میں سے ایک رگ وید کی تخلیق اسی علاقے میں ہوئی اور سنسکرت کے عالمی شہرت یافتہ قواعد نویس عالم آچاریہ پانی کا تعلق بھی اسی نواح سے تھا اور برصغیر کی قدیم ترین یونیورسٹی ٹکسلا کے آثار بھی میانوالی کے شمال مغربی علاقے سے بہت دور نہ تھے۔

رام لعل نے خود کئی جگہ میانوالی کو اپنی جائے ولادت بتاتے ہوئے اس پر فخر کا اظہار بھی کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے دادا شری چھتا رام خاص میانوالی کے رہنے والے نہیں تھے، بلکہ اس کے قریب ہی واقع دَتا خیل نامی گاؤں سے میانوالی آ کر آباد ہوئے تھے۔ رام لعل نے اپنے خاندان سے متعلق باتیں لکھتے ہوئے بڑی حد تک سچائی کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ انھوں نے اپنی یادوں کی بنیاد پر یہ بھی لکھا ہے کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو گھر میں خاصی خوشحالی دیکھی۔ دادا جی نے جو پرانا مکان خریدا تھا اسے گرا کر ایک نیا مکان جو نسبتاً کافی بڑا تھا اپنے اور اپنے بیٹوں کے لیے تعمیر کرا لیا تھا۔ اسی میں دادا جی کی

کپڑے کی دُکان تھی جس میں وہ خود اور اُن کے والد اور چچا بیٹھا کرتے تھے۔ اپنے دادا یعنی شری چھتا رام جی کے ماضی کے بارے میں رام لعل نے واضح الفاظ میں بہت سی باتیں لکھی ہیں جن میں سے ایک یوں ہے:

> ''میں نے اپنی دادی سے سنا تھا۔ پہلے پہل تیرے دادا بہت غریب تھے۔ ایک چھوٹی سی دُکان پر بیلوں اور دوسرے جانوروں کو سجانے کا سامان بیچا کرتے تھے۔ موٹے موٹے رنگین منکے اور اس کے گلے کی سوت کی پٹیاں اور گھنٹیاں۔ ان کے پاس ایک گھوڑی تھی جس پر سوار ہو کر وہ اپنے گاؤں دتا خیل سے میانوالی آیا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے ریشم بیچنا شروع کر دیا جو وہ کراچی کا لمبا سفر کر کے لے آتے تھے۔ میرے دادا کے پانچ بھائی اور تھے۔ وہ سب محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے تھے۔ اناج منڈی میں اپنی پیٹھ پر بوریاں ڈھوتے تھے۔ چونکہ وہ غریب بھی تھے اس لیے ان میں سے کسی کی شادی نہ ہو سکی۔ اس زمانے میں مفلسی ایک سماجی نا اہلیت تصور کی جاتی تھی۔ وہ سب کے سب عین جوانی میں مر گئے۔ صرف میرے دادا بچے۔ ان کی شادی اس لیے ہو سکی کہ ان کا کاروبار چل نکلا تھا۔ لیکن اس کے لیے انھیں بدلے میں اپنی بہن کی شادی میرے ایک موسیرے بھائی (نرائن داس بانگہ) کے ساتھ کرنی پڑی تھی۔ میری آنکھیں بچپن سے ہی خراب رہتی تھیں لیکن تیرے دادا نے مجھے قبول کر لیا تھا۔''
>
> (رام لعل: کوچۂ قاتل 1993 لکھنؤ: صفحات 42-41)

رام لعل نے اپنے دادا جی شری چھتا رام چھابڑا سے متعلق اپنی پرانی یادوں کا ذکر کئی افسانوں کے علاوہ اس ڈائری کے اندراجات میں بھی کیا ہے جو وہ برسوں بعد لکھنؤ میں لکھتے رہے تھے اور جو ''رام لعل کے شب و روز'' عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ مذکورہ ڈائری میں مورخہ 8/مارچ 1969 کو انھوں نے لکھا تھا:

''مجھے یاد ہے میں نے بچپن میں اپنے دادا اور والد کو پاٹھ پوجا کرتے دیکھا ہے۔ میرے دادا پڑھے لکھے نہیں تھے۔ بس مالا جپتے تھے۔ صبح وشام۔ دو وقت۔ صبح صبح سورج کی طرف پانی بھی اچھالتے تھے۔ والد صاحب نے دوسری منزل پر ایک چھوٹی سی کوٹھری میں پوجا پاٹھ کا سامان سجا رکھا تھا۔ ایک تخت پر بڑا سا آسن بچھا رہتا تھا۔ ایک چھوٹی چوکی پر اردو میں چھپی ہوئی ایک ہزار صفحات پر مشتمل شریمد بھاگوت، رام اور کرشن کے علاوہ برہما، وشنو اور مہیش کی بھی تصاویر رکھی رہتی تھیں۔ دھوپ جلانے کا ایک چھوٹا سا اسٹینڈ بھی۔ ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی پوجا کرنا سیکھا۔ تب آٹھویں درجے میں پڑھتا تھا۔ شری مد بھاگوت بھی پڑھنے لگا۔ ایک طویل کہانی یا ناول کی طرح۔ صبح کے وقت کے علاوہ دن میں کئی گھنٹے اسے پڑھنے میں گزار دیتا۔''

(رام لعل کے شب وروز :صفحہ 195)

رام لعل کے دادا چھتا رام جی ایک سیدھے سادے دیہاتی انسان تھے، جسے مقامی زبان میں پینڈو کہا جاتا ہے۔ اگر چہ ان کی تعلیم بہت کم تھی لیکن انھوں نے تجربات زندگی بہت زیادہ حاصل کیے تھے۔ دنا خیل سے میانوالی منتقل ہوتے وقت اگر چہ وہ نہایت مفلس تھے لیکن نئی جگہ آنے کے بعد انھوں نے کڑی محنت اور سمجھ بوجھ کے بل پر خاصی ترقی کر لی اور ان کا شمار میانوالی کے کھاتے پیتے گھرانوں میں ہونے لگا۔ قصبے میں ان کے بارے میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ انھیں کہیں کوئی دفینہ مل گیا تھا جس کی وجہ سے وہ راتوں رات غریب سے امیر ہو گئے تھے۔ لیکن چھتا رام اس بات کو افواہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ کم عرصے میں امیر بن جانے والے لوگوں کے بارے میں لوگ عام طور پر ایسی ہی باتیں گھڑ لیا کرتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اپنے دادا چھتا رام جی کے بارے میں خود رام لعل نے لکھا ہے :

''میرے دادا پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن صرف کوکی (منڈی) میں دستخط کر لیتے تھے۔ میں نے انھیں صبح وشام مالا

پھیرتے ہوئے دیکھا تھا۔ صبح سویرے سورج کی طرف پانی
اچھالتے اور اسے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا کرتے۔ وہ مجھے
بہت پیار کرتے تھے۔ کبھی کبھی تیج تہوار کی صبح مجھے اپنے ساتھ
دریائے سندھ کی طرف لے جاتے اور اپنے کاندھے پر بٹھا کر
دریا کے اندر گلے گلے تک گہرائی میں لے جاتے اور ڈبکیاں لگا گا
کر اشنان کرتے تھے۔ میں ان کی گردن کے دونوں طرف ٹانگیں
لٹکائے اور ان کے سر کو بازوؤں سے مضبوطی سے تھامے رہتا۔ اس
طرح نہانا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

(رام لعل ''کوچۂ قاتل'' :صفحہ 43)

رام لعل کے دادا دادی کی اولادوں میں تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ ان سب کی پیدائش ان کے آبائی گاؤں دتا خیل میں ہوئی تھی۔ رام لعل کے والد کا نام لچھمن داس تھا۔ ان کے دو بھائیوں میں سے ایک کا نام ٹھاکر داس تھا جو عمر میں ان سے بڑے تھے۔ یہ رام لعل کے تایا تھے۔ دوسرا بھائی ان کے والد سے چھوٹا تھا۔ اس کا نام ہری چند تھا۔ رام لعل کے دادا جی کی کپڑے کی بڑی دُکانیں تھیں جن میں سے ایک پر رام لعل کے تایا بیٹھتے تھے اور دوسری دکان پر ان کے والد اور چچا۔ رام لعل نے اپنے دادا کی معاشی جدوجہد اور ان کے مزاج کی سادگی و انکساری کا نقشہ ایک افسانے ''ایک معمولی آدمی کی تصویر'' (رسالہ فنون: لاہور) میں بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ رام لعل کے والد اور چچا دونوں نے انگریزی مضمون کے ساتھ ہائی اسکول کے امتحانات پاس کیے تھے۔ لیکن ان کے مطالعے کا شوق روزانہ اخبارات اور چند مذہبی و ادبی کتابوں تک ہی محدود تھا جن کے مصنفین میں پریم چند بھی شامل تھے۔ اگر اتنے ہی کو رام لعل وراثت میں ملے ہوئے شوقِ مطالعہ سے تعبیر کرتے ہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ذہن پر نوعمری میں ہی کچھ اثرات یقیناً پڑے تھے۔ رام لعل نے اپنی ڈائری میں چچا ہری چند کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

''بچپن میں میرے چچا ہی میرے ہیرو تھے۔ مجھ سے
دس سال بڑے۔ خوب صورت، دلکش اور رومانی مزاج کے۔ ان

کے بارے میں کئی رومانی قصے مشہور ہوئے۔ جنھیں سن سن کر میں خوش ہوتا تھا۔ متعجب بھی ہوتا۔ وہ محبت بھری غزلیں اور گیت گاتے۔ تو میں بہت ہی متحرک ہو اٹھتا..... تقسیم وطن کے بعد انھیں بزنس چھوڑ کر ایک اسکول میں پڑھانا پڑ گیا۔ روزانہ پانچ چھ میل پیدل چل کر جاتے۔ ان کی پہلی بیوی کا شادی کے تھوڑے ہی عرصے بعد انتقال ہو گیا تھا۔ (مجھے یہ واقعہ یاد ہے۔ چچی کی ارتھی کو میں نے ہی آگ دی تھی۔ تب میں آٹھویں درجے میں پڑھتا تھا۔ اُن کی دوسری بیوی بہت سخت گیر تھی۔ بچوں کو بے طرح پیٹتی اور کوستی رہتی تھی۔ چچا کو یہ سب اچھا نہیں لگتا لیکن وہ سوائے کڑھنے کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔''

(رام لعل کے شب و روز: ادبی ڈائری کے اوراق مرتبہ: ہما جمال رضوی 1996 لکھنؤ)۔

رام لعل اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں کہ ان کے ماموں کو ہفتہ وار اخبارات پڑھنے کا بے حد شوق تھا جن میں ایک اخبار ''نوجوان'' کے نام سے نکلتا تھا۔ جب رام لعل چھٹے اور ساتویں درجے میں زیر تعلیم تھے تو وہ اپنے ماموں کے یہاں سے ان کے اخبارات کے پلندے کے پلندے لے آتے تھے اور انھیں بڑے ذوق اور شوق سے پڑھتے تھے۔ ان کا فطری جھکاؤ اردو افسانوں کے مطالعے تک ہی محدود تھا۔ اس کی وجہ بھی رام لعل اس طرح بیان کرتے ہیں:

''مجھے اپنے بچپن سے ہی کہانیاں سننے کا شوق تھا اور میں اپنی نانی اور دادی سے اصرار کر کے کہانیاں سنا کرتا تھا''۔

(رام لعل کے شب و روز)

عام طور پر ہر تخلیق کار کی زندگی میں کچھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کی وجہ سے اس کا فطری جھکاؤ ادب کی تخلیق یا فن مصوری یا دیگر فنون کی طرف ہو جاتا ہے۔ رام لعل کی زندگی کا ایک المناک واقعہ ان کی ڈھائی سال کی عمر میں ان کی والدہ کا انتقال تھا۔ اس عمر میں

ماں سے محرومی کا احساس اور بھی بڑھ جاتا ہے جب بچے کا باپ دوسری شادی کر لیتا ہے اور اس طرح وہ اپنے باپ کی ہمدردی سے بھی کافی حد تک محروم ہو جاتا ہے۔ رام لعل نے اپنی خودنوشت میں بچپن کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ میں ''بچپن میں اپنے دادا دادی اور نانی کے بہت قریب رہا جن سے مجھے بے پناہ شفقت اور پیار ملتا تھا لیکن میرے دل میں یہ احساس کبھی نہ نکل سکا کہ وہ سب مجھ پر ترس کھا کر ایسا کرتے ہیں۔ یعنی میرے اندر ماں کی محرومی کا احساس ہمیشہ بڑھتا گیا۔ سوتیلی والدہ کی وجہ سے گھر میں جو آئے دن جھگڑے ہوتے تھے ان کی وجہ سے میں خود کو ایک بھرے پُرے و آسودہ گھر میں تنہا اور غیر محفوظ محسوس کرتا تھا اور میرے اندر لاشعوری طور پر ایک قسم کی فراریت کا جذبہ پیدا ہوتا گیا۔''

رام لعل کو اپنے والدِ محترم سے کوئی شکایت نہ تھی کیونکہ ان کا برتاؤ عموماً شفقت آمیز ہوا کرتا تھا۔ والد اپنی دوسری بیوی کی بدمزاجی اور سوتیلے بیٹے (رام لعل) کے تئیں اس کے معاندانہ رویہ سے بھی عاجز و نالاں تھے۔ سوتیلی ماں کے ظلم و ستم کا مداوا باپ کی نوازش و کرم ہی ہو سکتے تھے جو رام لعل کو حاصل تھے۔ اپنی ڈائری میں انھوں نے واضح الفاظ میں لکھا ہے:

> ''مجھے اپنے والد سے بے پناہ محبت ملتی تھی لیکن وہ (میری سوتیلی ماں سے چھپا کر) گھر سے باہر ہی مجھ سے اس طرح ملتے تھے۔ کسی دکان پر لے جا کر خوب کھلاتے پلاتے! دودھ کی برف ملی ہوئی لسّی کا ٹھنڈا ٹھنڈا ذائقہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ وہ میرے کپڑے دھوبی سے دھلوا کر دکان پر ہی رکھ لیتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے مجھے پہنایا کرتے تھے۔''
>
> (رام لعل کے شب و روز: صفحہ 58)

رام لعل کے اس وقت کے ذہنی کوائف کو سمجھنے کے لیے ایک طرف تو ان کے مطالعے کے شوق کو پیش نظر رکھنا ہوگا دوسری طرف رام لعل کے فلمیں دیکھنے کے بے پناہ شوق کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جس کے بارے میں انھوں نے خود اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ جب وہ بارہ برس کے تھے اور ساتویں درجہ میں زیر تعلیم تھے تو ان کے والد نے اپنا ایک سنیما گھر ''دل رُبا ٹاکیز'' کے نام سے تعمیر کرایا تھا، جہاں انھوں نے بے شمار اچھی و معمولی

فلمیں مثلاً دیوداس، دھوپ چھاؤں، چنڈی داس، لیلیٰ مجنوں، عورت کا پیار، سلور کنگ وغیرہ دیکھی تھیں اور لگ بھگ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے اندر کہانی لکھنے کی خواہش بھی محسوس کر لی تھی۔

رام لعل نے اپنی پیدائش کے بعد تین سال بھی مکمل نہیں کیے ہوں گے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ 1925 کی بات ہے۔ رام لعل کے بعد انھوں نے ایک اور لڑکے کو جنم دیا تھا جس کا نام شیام لعل رکھا گیا تھا۔ والدہ کے انتقال کے وقت شیام لعل کی عمر کوئی چھ مہینے رہی ہوگی۔

رام لعل کو تعلیم کے لیے پہلے پہل جس اسکول میں داخل کرایا گیا وہ مقامی سناتن دھرم مندر کے اندر واقع ایک چھوٹا سا اسکول تھا جہاں پہلی جماعت میں انھیں صرف ہندی پڑھائی گئی۔ چند مہینوں کے بعد کسی وجہ سے وہ اسکول بند کر دیا گیا اور وہاں پڑھنے والے سارے بچوں کو ایک اور سناتن دھرم پرائمری اسکول میں منتقل کر دیا گیا۔ اس اسکول میں اردو پڑھائی جاتی تھی۔ یہاں روایتی طور پر لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ کاغذ کی کمی اور مہنگائی کی وجہ سے سارے بچوں کو لکھنے کی مشق لکڑی سے بنی ہوئی تختی پر ملتانی مٹی پوت کر کالی سیاہی اور نرسلے کے قلم سے کرائی جاتی تھی۔ اُس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے رام لعل لکھتے ہیں کہ سناتن دھرم مندر کے اس پرائمری اسکول میں :

> ''اُردو املا سکھانے کے لیے ایک پنڈت جی مامور تھے۔ جو باری باری لڑکوں کے پیچھے دری پر جا کر بیٹھ جاتے تھے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر قلم سے حروف کے شوشے بنانا اور کشش کھینچنا سکھاتے تھے جب کسی لڑکے کے پیچھے چپک کر بیٹھ جاتے تو دوسرے لڑکے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز اشارے کر کے مسکرایا کرتے۔ مجھے اس اسکول ماسٹر کا نام یاد نہیں رہا۔ دوسرے درجے کے ایک ٹیچر شنکر داس کھیڑا یاد آتے ہیں جن کا برسوں بعد بھی سامنا ہو جاتا تو میں انھیں ہاتھ جوڑ کر نمستے کہتا اور وہ بڑی شفقت سے میری خیریت پوچھتے تھے۔ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر دیال چند کا لڑا تھے جو پولیو کی وجہ سے لنگڑے تھے اور ہمیشہ ایک

چھوٹے قد کی گھوڑی پر بیٹھ کر اسکول آتے تھے۔ وہ بہت ہی خوش
پوش تھے۔ ہمیشہ صاف ستھری شلوار قمیض اور کوٹ پہنتے اور کلاہ پر
شملے والی پگڑی بھی باندھتے تھے۔''

(رام لعل: کوچۂ قاتل: صفحہ 27)

رام لعل نے چوتھے درجے تک کی تعلیم سناتن دھرم مندر کے اسی پرائمری اسکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد انھیں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے راجا رام موہن رائے ہندو ہائی اسکول میں بھیجا گیا۔ یہ اسکول بھی میانوالی ہی میں تھا۔ یہاں انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ اس طرح وہ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان میں بھی اپنی استعداد بڑھاتے رہے۔ ساتویں اور آٹھویں کلاسوں میں انھوں نے ہندی اور سنسکرت زبانیں بھی سیکھیں اور 1938 میں میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ وہ اپنے درجے کے بے حد ذہین طالب علموں میں نہیں تھے اور نہ ہی ان کا شمار اسکول کے پھسڈی رہنے والے بچوں میں کیا جاتا تھا۔ اردو، انگریزی اور تاریخ جیسے مضامین سے انھیں خصوصی دلچسپی تھی۔ ان مضامین کے اساتذہ بھی رام لعل سے خوش رہتے تھے۔ تاہم میٹرک میں وہ اول نمبر سے کامیاب نہیں ہوئے بلکہ دوسرے نمبر پر رہے۔

رام لعل کے دادا اور دادی اُن سے بڑی اُنسیت رکھتے تھے۔ برسوں گزر جانے کے بعد بھی رام لعل ان کی محبتوں کو نہیں بھولے اور انیس سو نوّے کی دہائی میں جب لکھنؤ میں اپنی سوانح عمری لکھنے بیٹھے تب بھی وہ دونوں انھیں یاد رہے۔ لکھتے ہیں :

''میرے دادا اور دادی مجھ سے اور میرے چھوٹے
بھائی سے اس لیے بے پناہ محبت کرتے تھے کہ ہماری والدہ ہمیں
بچپن ہی میں چھوڑ کر چل بسی تھیں اور میرے والد نے دوسری
شادی کر لی تھی۔ اپنے نانا نانی سے بھی ہمیں ویسا ہی پیار ملا جن کا
وطن عیسیٰ خیل تھا لیکن وہ کافی عرصے سے میانوالی میں آ کر آباد
ہو چکے تھے۔ میری نانی بچپن سے پولیو کی وجہ سے لنگڑی تھیں۔
اُن کا نچلا دھڑ بے کار تھا۔ زمین پر گھسٹ گھسٹ کر چلتی تھیں لیکن

اس جسمانی معذوری کے باوجود ان کا حکم پورے گھر پر چلتا تھا۔
ان کا رعب داب اس وقت ٹوٹنا شروع ہوا جب میرے ماما جی
نے پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہونے پر اپنی مرضی سے تلہ گنگ کی
ایک دوسری عورت سے شادی کر لی۔ میری دوسری ممانی بے حد
خوب صورت تھی لیکن خود پسندی کا شکار تھی۔ اس نے آتے ہی گھر
کا نقشہ بدل ڈالا۔ پرانے رشتے ناطے ختم کر دیے۔ اس کے
بطن سے دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اپنی والدہ کے انتقال کے بعد کچھ
سال تک میں اور میرا چھوٹا بھائی ہر سنیچر اور اتوار کو نانی کے یہاں
چلے جاتے تھے۔ لیکن نئی ممانی کے رویے کو دیکھ کر ہم نے وہاں
جانا کم کر دیا۔''

(رام لعل: کوچۂ قاتل: صفحہ 45)

رام لعل نے اپنی ایک کہانی ''ایک ادھوری تخلیق'' میں بھی ماضی بعید کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے اپنے زمانۂ طالب علمی کی یادیں ان الفاظ میں قلم بند کی ہیں:

''اُس وقت میں نویں درجہ میں پڑھ رہا تھا اور اپنے
اسکول راجا رام موہن رائے ہندو ہائی اسکول کی ساری لائبریری
چاٹ چکا تھا اور اس کے علاوہ شہر کی دیگر تین لائبریریوں آریہ
سماج لائبریری، اسلامیہ لائبریری اور میونسپل لائبریری کی اردو و
ہندی کی قریب قریب ساری کتابیں پڑھ لی تھیں اور شہر کے ایک
مکان سے ایک پیسہ روز پر کرائے پر ملنے والے بے شمار ناول بھی
پڑھ چکا تھا۔ ہمارے اردو کے استاد ٹیک چند آریہ خورسند نے
مجھے اپنی کلاس کی بزم ادب میں کوئی کہانی پڑھنے کی دعوت دی۔
میں نے کسی کتاب سے ایک کہانی نقل کر لی اور جب کلاس میں
کہانی پڑھ رہا تھا تو اچانک میری نظروں کے سامنے سطور تیر تیر
گئیں اور میرے لیے پڑھ کر کہانی سنانے کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا

تو میں نے وہ کہانی لپیٹ لپاٹ کر جیب میں رکھ لی اور آگے کی
کہانی فی البدیہہ طور پر بڑھاتا چلا گیا۔ اس طرح میں کہہ سکتا
ہوں کہ میں آدھی تخلیق کا تو مالک بن ہی گیا تھا لیکن جب ہمارے
اسکول ماسٹر خورسند صاحب نے اپنے تاثرات بیان کیے تو انھوں
نے میرے بارے میں کہا۔ کہانی تو اچھی ہے لیکن رام لعل کی
زبان اردو، ہندی اور سنسکرت الفاظ کا معجون مرکب بن گئی ہے۔''

رام لعل کو اپنی تخلیقی زبان کے بارے میں یہ پہلی تنبیہہ اپنے اردو کے استاد سے ملی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رام لعل اپنی کلاس میں بیک وقت اردو، ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبانیں پڑھ رہے تھے اور ان کا ایک اور فطری رجحان مصوّری کے علاوہ تاریخ کے مطالعے کا بھی تھا۔ لگ بھگ اُسی زمانے میں رام لعل نے کچھ اور کہانیاں بھی لکھیں اور انھیں لاہور سے چھپنے والے اردو روزنامہ ''ملاپ'' اور ''پرتاپ'' میں چھپنے کے لیے بھیجا لیکن ان اخباروں میں کبھی نہ چھپ سکیں۔ دراصل بقول ان کے یہ ان کی اپرینٹس شپ کا زمانہ تھا جو ان کے ہائی اسکول پاس کرنے تک 1938 کے بعد لاہور میں قیام کے دوران دو سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد ان کی کہانیاں لاہور کے ہفت روزوں اور ماہناموں میں چھپنے لگیں۔ وہ اپنی پہلی تخلیق افسانہ بعنوان ''تھوک'' کو قرار دیتے ہیں جو ہفت روزہ ''خیام'' لاہور میں 1943 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کے افسانے شاہکار، بیسویں صدی اور کہانی جیسے ماہناموں میں تواتر کے ساتھ چھپنے لگے۔

رام لعل نے افسانہ نگاری کا آغاز تو اپنے زمانۂ طالب علمی سے ہی کر دیا تھا۔ جب وہ چلتے چلاتے کچے پکے افسانے رقم کر دیا کرتے تھے۔ رام لعل نام سے ان کے افسانوں کی باقاعدہ اشاعت کا آغاز 1943 سے ہوا۔ رسالہ ''کوہسار'' کے مدیر کو ایک ادبی انٹرویو دیتے ہوئے ان کے استفسار پر رام لعل نے بتایا تھا کہ:

''میرے ادبی سفر کا آغاز چھپی ہوئی تحریروں اور
موجودہ نام سے 1943 میں ہوا۔ جب میری پہلی کہانی ''تھوک''
ہفتہ وار ''خیام'' لاہور میں شائع ہوئی۔ جس کے ایڈیٹر شبلی بی۔ کام

(مرحوم) تھے۔ میری دوسری کہانی ''جلن'' ماہنامہ ''شاہکار'' لاہور میں شائع ہوئی۔ جس کے مدیر شیر محمد اختر تھے۔ مجھے آغاز سفر سے احمد ندیم قاسمی کی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی۔ جنھوں نے میری چند کہانیوں پر اصلاح دی تھی۔ انھوں نے میرے پہلے افسانوی مجموعے ''آئینے'' (مطبوعہ 1945، انٹرنیشنل پبلشرز، لاہور) میں میرا تعارف بھی لکھا تھا۔''

(ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی): رام لعل سے ایک انٹرویو مشمولہ ''رام لعل: شخصیت اور بساطِ فکر وفن'': مرتبہ خان فہیم 1994 بدایوں۔)

اپنے ادبی اور قلمی نام کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے رام لعل نے اپنی خود نوشت سوانح عمری ''کوچۂ قاتل'' میں لکھا ہے:

''جب 1943 میں میں نے اپنے موجودہ نام سے لکھنا شروع کیا تو مجھے اپنے کسی ہم نام کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ شروع میں جب میں لکھنے کی ابھی مشق ہی کر رہا تھا تو ایک رومانی یا شاعرانہ جذبے کے تحت تین بار اپنے نام کے ساتھ تصور، پردیسی اور دوشی تخلص ٹانک چکا تھا۔ چونکہ میں نے کبھی شاعری نہیں کی تھی اور افسانہ نگاری ہی میں میری دلچسپی زیادہ تھی، اس لیے میں نے بالآخر موجودہ مختصر نام سے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا۔ رام لال کو رام لعل کی اسٹائل سے لکھنے کی ابتدا میں نے 1948 ہی میں کی تھی جس پر میں آج تک قائم ہوں۔''

(رام لعل: کوچۂ قاتل: صفحہ 219)

رام لعل 1938 میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد نارتھ ویسٹرن ریلوے کی میکینکل ورکشاپ میں تربیت حاصل کرنے کے لیے داخل ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً پندرہ برس کی تھی۔ یہ ریلوے ورکشاپ لاہور سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع

تھا۔ یہاں آنے کے بعد رام لعل کا زیادہ تر وقت ورکشاپ میں کام کرنے والے لوگوں کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ جن میں سے بیشتر ان کی طرح اپرینٹس ہی تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب رام لعل کی افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں رام لعل کو افسانوی ادب کے مطالعے کا شوق تو تھا لیکن خود انھوں نے افسانہ نگاری شروع نہیں کی تھی۔ درحقیقت رام لعل کو خارجی ماحول کے نامساعد حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر لاہور جانا پڑا تھا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہی تھی کہ ان کی سوتیلی والدہ کو وہ ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ اور وہ سوتیاہ ڈاہ کی وجہ سے انھیں مستقل طور پر ایک ناقابل حل مسئلہ بنا چکی تھی۔ وہ ہر وقت رام لعل کی شکایتیں کرتی رہتی تھی۔ انھیں ستاتی رہتی تھی اور کسی طور گھر سے نکلوا دینا چاہتی تھی۔ روز روز کی چخ چخ سے ان کے والد بھی خاصے پریشان تھے۔ لیکن وہ رام لعل سے گہری ہمدردی رکھنے اور اپنی دوسری بیوی کی ظلم و زیادتی کا اندازہ کر لینے کے باوجود خود کو بے دست و پا محسوس کرتے تھے۔ اسی لیے جب لاہور کے ریلوے ورکشاپ میں اپرینٹس کے طور پر بھرتی ہونے کی بات سامنے آئی تو ان کے والد نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ رام لعل کو وہاں بھیج دیا جائے۔ اور اس طرح نچلے متوسط طبقے کے ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھنے والا نوجوان بیس بائیس روپے ماہوار کے مشاہرے پر لاہور بھیج دیا گیا۔ جہاں اسے زندگی کے نئے مسائل اور نئے تجربوں سے گزرنا پڑا اور نئے شہر میں تنِ تنہا تمام حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ میانوالی میں عزیز و اقارب اور دوست آشنا سبھی اپنے تھے۔ جانے پہچانے، مشفق و مہربان لیکن اس کے برعکس لاہور کی زندگی اس سے بہت مختلف تھی۔ رام لعل کے لفظوں میں:

> ''ریلوے ورکشاپ کی دنیا بالکل دوسری دنیا تھی۔ لوکو اور گیرج دونوں ورکشاپوں میں بیس پچیس ہزار کے قریب مزدور کام کرتے ہوں گے۔ ان میں خلاصی، فٹر، خرادیے، مستری، اپرینٹس اور فورمین وغیرہ شامل تھے۔ دونوں ورکشاپوں میں جو ایک دوسرے کے قریب قریب واقع تھے۔ مال گاڑیاں، سواری گاڑیاں اور انجن تعمیر کیے جاتے تھے۔ ان کے ڈھانچوں اور دیگر کل پرزوں کے الگ الگ چھوٹے ورکشاپ تھے۔ کہیں بھٹیوں

میں کچا لوہا، پیتل اور تانبا پگھلایا جاتا تھا۔ کہیں چھت کے ساتھ
ساتھ لگے ہوئے دیو قامت کرین پورے پورے انجن اٹھائے
ادھر سے ادھر لے جاتے نظر آتے تھے۔ ان ورکشاپوں میں کام
کرنے والے ہر فرقے کے لوگ تھے۔ ہندو، مسلمان، سکھ و
عیسائی اور کئی انگریز بھی جو عموماً اعلیٰ عہدوں پر ہی فائز تھے۔''

(رام لعل: کوچۂ قاتل: صفحہ نمبر 62: لکھنؤ: 1993)

ریلوے کی ملازمت نے رام لعل کو بہت کچھ سکھایا بھی اور ان کے اندر کی انسانیت اور دردمندی کو ہمیشہ زندہ رکھا۔ انھوں نے اپنی مختصر سی زندگی میں مسلسل جدو جہد کی اور عوام الناس کے درمیان ان کے ساتھ ساتھ رہے۔ ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی ادبی فیشن یا حصولِ شہرت کے لیے نہیں رہی بلکہ اس لیے رہی کہ اپنے سنگھرش کے دنوں میں ان کا سماج کے محنت کش طبقے کے ساتھ گہرا تعلق تھا اور یہ تعلق آخر دم تک قائم رہا۔ رام لعل اس ضمن میں ''کوچۂ قاتل'' میں لکھتے ہیں:

''ملک کی تقسیم سے آٹھ نو برس پہلے میں لاہور جا کر
رہنے لگا تھا۔ پہلے چند سال ریلوے ورکشاپ میں بطور ٹرنر
اپرینٹس گزارے تھے۔ جہاں چوبیس، پچیس ہزار کے قریب
مزدور کام کرتے تھے۔ ان کی ایک باقاعدہ ٹریڈ یونین تھی۔
کامریڈ ہلّر تھے اور ان کے پیچھے پیچھے سارے ہی مزدور بڑے
جوش و خروش سے ''انقلاب زندہ باد'' کے نعرے لگایا کرتے تھے۔
اس ہجوم میں میں بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہوتا تھا۔ میرے دو استاد
مستری پیراں دتہ اور سردار نانک سنگھ مجھ پر بہت زیادہ مہربان
تھے۔ انھوں نے مجھے ریلوے مزدور یونین کی ماضی کی کئی
ہڑتالوں کے بارے میں بڑی تفصیل سے بہت کچھ بتایا تھا۔ وہی
تین اور چند اور مزدور جو مارکسی پارٹی کے ساتھ سرگرم ممبر تھے،
مجھے ٹریڈ یونین کے اصولوں کے بارے میں باقاعدگی سے تعلیم

دینے لگے تھے۔ کامریڈ محمد اسمٰعیل، کامریڈ یوگراج اور کامریڈ ڈار خرادیہ تھا۔ اس نے مجھے خراد چلانے کا کام سکھایا تھا۔ یوگراج سینئر اپرینٹس تھا اور ڈار کاشمیری ایک تربیت یافتہ فٹر تھا۔ ہماری رہنما کامریڈ عبدالباری کی مشہور تصنیف 'کمپنی کی حکومت' اور لینن کی دو ایک کتابیں تھیں۔ جن کی وضاحت ایک اسٹڈی سرکل میں کی جاتی تھی۔ جس کی میٹنگیں کبھی میری، کبھی ہیرانند سوز کی قیام گاہ پر ہوتی تھیں۔ سوز بھی میری طرح اپرینٹس تھا اور قلعہ گوجر سنگھ کی اسی گرودوارہ گلی میں رہتا تھا جہاں میں مقیم تھا۔ کانگریسی پالیسیوں اور مارکسی نظریات میں جو نمایاں فرق تھا مجھے اسی زمانے میں معلوم ہو گیا تھا۔''

آزادی اور تقسیم وطن سے کچھ پہلے رام لعل لاہور میں رہنے لگے تھے۔ یہیں ان کے قلم نے تیز چلنا سیکھا۔ اور یہیں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی شناخت قائم ہوئی۔ یہیں ان کی ملاقاتیں قمر جلال آبادی، شبلی بی-کام اور احمد ندیم قاسمی سے ہوئیں جو انھیں ایوانِ ادب کے جلسوں میں لے کر گئے اور وہاں انھوں نے مختلف وقفوں سے اپنے دو افسانے بھی سنائے تھے۔ اُن محفلوں میں مولانا صلاح الدین احمد، مرزا ادیب، شیر محمد اختر، قیوم نظر وغیرہ جیسے مشاہیر بھی شریک تھے۔ ایوانِ ادب- ارباب ذوق اور ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے بین بین چل رہا تھا۔ دراصل یہی زمانہ رام لعل کی ذہنی نشوونما کا تھا جب انھیں اپنے سے بڑے ادیبوں کے خیالات اور تنقیدیں سننے کا بھی موقع مل رہا تھا۔ اور ان کے اندر ایک نیا اعتماد اس دور کے لکھنے والوں کی تصانیف پڑھ کر بھی پیدا ہو رہا تھا۔ ان کے محبوب ترین افسانہ نگاروں میں احمد ندیم قاسمی کے علاوہ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی وغیرہ شامل تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ انھوں نے اس زمانے تک ٹیگور، پریم چند، سدرشن، فیاض محمود، نیاز فتحپوری، راشد الخیری، ڈپٹی نظیر احمد، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کو پڑھ لیا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ 1945 تک جب رام لعل کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''آئینے'' لاہور سے شائع ہوا، جس کا تعارف ان کے معنوی استاد احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا تو

اس وقت تک رام لعل قدیم و جدید ادب کے مطالعے سے اچھی طرح مستفید ہو چکے تھے۔ اب ان کے زیرِ مطالعہ ادبِ لطیف، ادبی دنیا، ساقی، نیرنگ خیال، سب رس جیسے رسالے رہتے تھے۔ اگرچہ کہ ان رسائل میں ان کے افسانے ایک تواتر کے ساتھ ہمیں آزادی کے بعد چھپے ہوئے ملتے ہیں۔

رام لعل اپنی سوانح عمری ''کوچۂ قاتل'' میں آزادی سے قریب نقلِ مکانی کا چشم دید بیان کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''جوں جوں تقسیم اور آزادی کے دن قریب آتے گئے ملک کے کئی شہر فسادات کی لپیٹ میں آتے گئے۔ ہمارا شہر میانوالی بھی اس ہنگامے سے نہ بچ سکا اور وہاں سے ہزاروں خاندان ریل گاڑی کے ذریعے امرتسر کے ادھر کے علاقوں میں پہنچنے لگے۔ میرے والد بھی سارے خاندان کے ساتھ جالندھر کی تحصیل نواں شہر کی ایک دھرم شالہ میں جا کر مقیم ہو گئے تھے لیکن میں ابھی تک اپنی بیوی اور چند ماہ کی ایک بچی کے ساتھ لاہور میں رہ رہا تھا۔ جولائی کے آخر میں ایک روز میں اور میرا ایک ساتھی شوکت رجنی پال دت کی نئی کتاب پر بحث کرتے ہوئے لاہور اسٹیشن پر چلے گئے یہ دیکھنے کے لیے کہ آج کون کون سی گاڑیاں نقلِ مکانی کرنے والوں کو لیے ہوئے وہاں سے گزرتی ہیں۔ اتفاق سے اس روز میانوالی ہی سے ایک اسپیشل ٹرین آئی ہوئی تھی جو انجن بدلنے کے لیے روکی گئی تھی۔ اس گاڑی میں مجھے بے شمار ہم وطن نظر آئے جو گاڑی سے اتر کر پانی اور کھانے کی اشیا حاصل کر رہے تھے۔ ان میں سے چند میرے ہم جماعت بھی تھے جو اب دُکانداری کا پیشہ اپنا چکے تھے۔ چند برس پہلے تک وہ حد درجہ شرارتی اور شوخ خوب صورت لڑکے تھے۔ اب ان کی شخصیت پر سنجیدگی اور نقلِ مکانی کی بیزاری اور تھکن نمایاں تھی۔''

یہی وہ زمانہ تھا۔ جب سیاسی سطح پر ملک کی تقسیم کا غلغلہ اٹھا تھا۔ کئی شہروں میں فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ پھر جب ملک تقسیم ہوگیا تو رام لعل کے لیے نقلِ مکانی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ لاہور جیسے علم وادب کے گہوارے اور تہذیب وتاریخ کے ایک اہم ترین مرکز کو چھوڑ کر ہندوستان کی طرف روانہ ہوجائیں۔ 15/اگست 1947 میں ہندوستان کو سیاسی طور پر آزادی تو مل گئی لیکن سماجی اور معاشرتی زندگیاں بربادی سے دوچار ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ تقسیمِ ہند نے ہزاروں، لاکھوں خاندانوں کے افراد کو بری طرح متاثر کیا۔ آزادی اور تقسیمِ وطن ان کے لیے خانماں بربادی کا باعث بن گئے۔ آزادیٔ ہند کے بعد رام لعل کو بھی نامساعد حالات کے ہاتھوں دربدری کا شکار ہونا پڑا۔ آزادی سے پہلے وہ میانوالی کو چھوڑ کر لاہور میں ملازمت سے وابستہ ہو چکے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد لاہور چھوڑ کر دہلی اور پنجاب کے بیچ چند مہینوں تک بھٹکتے رہے۔

رام لعل بچپن میں اپنے ہم عمر کے بچوں کے ساتھ ایک دوسرے کے کرتے کے دامن پکڑ کر ایک کے پیچھے ایک چل کر ریل کا کھیل کھیلا کرتے تھے اور سب سے آگے انجن بن کر سیٹی بجاتے ہوئے چلتے تھے۔ بچپن میں ریل کا کھیل کھیلنے والے رام لعل چھابڑا کو قسمت کے ہاتھوں بڑے ہوکر محکمۂ ریلوے کی ملازمت ملی۔ ماقبل یہ کہا جاچکا ہے کہ تقسیمِ ہند سے پہلے ہی رام لعل محکمۂ ریلوے سے وابستہ ہو چکے تھے اور انھیں ریلوے کی ملازمت کا تھوڑا بہت تجربہ بھی تھا۔ تقسیم کے بعد بھی وہ اسی محکمے میں ملازمت کے لیے کوشاں رہے اور انھیں اس سلسلے میں کامیابی بھی ملی۔ پنجاب سے دہلی اور دہلی سے ان کا ٹرانسفر ہندوستان کے قدیم تاریخی، مذہبی اور ثقافتی شہر بنارس میں ہوگیا جو ایسٹرن ریلوے کلکتہ کے ہیڈ آفس کا ایک ڈویژنل آفس تھا۔ ٹرانسفر آرڈر ملنے پر عموماً لوگ ناخوش ہوتے ہیں اور خواہی ناخواہی سرکاری احکامات کی تعمیل کرتے ہیں۔ لیکن رام لعل کے لیے یہ ایک خوشی کی بات تھی کیونکہ انھیں پہلی بار کسی آفس میں کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ اُسی دن دہلی سے بنارس کے لیے روانہ ہوگئے۔ جس دن وہ بنارس پہنچے، یہ اتفاق ہی تھا کہ اُسی دن مدن موہن مالویہ برج کا افتتاح ہوا تھا۔ آگے کی کہانی خود رام لعل نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''کوچۂ قاتل'' میں ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''جب ہم ایک درجن کے قریب کمرشیل کلرک جو لاہور، کراچی، کوئٹہ، فورٹ سنڈیمان، لنڈی کوتل، مظفر گڑھ، ملتان وغیرہ سے آئے تھے۔ شلواریں، قمیض، کوٹ پتلونیں اور محمد علی جناح کے نام سے موسوم ٹوپیاں پہنے 4/دسمبر 1947 کو وہاں (بنارس کے ریلوے کلیم آفس میں) پہنچے تو دفتر کے دھوتی و کرتا پوش عملے نے ہماری خوش پوشی کو حیرت سے دیکھا جو ان کے طرز معاشرت کے لیے اجنبی تھی۔ ہمارے دفتر میں کچھ مسلمان افسر اور اسٹاف کے لوگ بھی تھے۔ جن میں سے بیشتر وہاں کے ہندوؤں کی طرح کرتا، دھوتی، پائجامہ اور گاندھی ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ کچھ ہماری طرح خوش پوش بھی تھے جن کے ساتھ میری فوراً دوستی ہوگئی۔ ان میں سے اردو کے ایک شاعر صغیر احمد صوفی بھی تھے۔ افسروں میں عبدالغفار خاں اور نظام الدین تھے جو ہمارے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ اثرات ہر طبقے پر واضح طور پر نظر آتے تھے۔ ہندو راشٹریہ سویم سیوا سنگھ کے حامی تھے جنھیں پاکستان سے آتے ہی میری مسلمانوں کے ساتھ دوستی پسند نہیں آئی اور مسلمانوں کے برتاؤ میں ذہنی شکست اور سیاسی مضمرات دونوں کی جھلک نمایاں تھی۔''

بنارس میں رام لعل کو ایک عجیب تجربہ ہوا اور وہ یہ، ایک روز ان کے لباس کو جو شلوار قمیض وغیرہ پر مشتمل ہوا کرتا تھا، مقامی لوگوں نے پسند نہیں کیا کیونکہ وہاں کے طرز معاشرت میں دھوتی کرتے کا چلن عام تھا۔ وہاں کے مسلمان افسر اور اسٹاف کے دوسرے لوگ بھی کرتے کے ساتھ دھوتی یا پائجامہ پہنتے تھے اور سر پر گاندھی ٹوپی اوڑھتے تھے۔ بنارس میں رام لعل کا قیام تقریباً دو سال تک رہا۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ لکھنؤ ہوگیا۔ یہ 1950 کی بات ہے۔ اس بارے میں رام لعل نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''کوچۂ قاتل'' میں لکھا ہے:

''ایک شہری کا کسی بھی بڑے یا اہم شہر کے ساتھ

مستقل یا عارضی رشتہ قائم ہو جانا اتفاقات ہی پر مبنی ہوتا ہے۔
آزادی کے بعد میں لاہور چھوڑ کر لکھنؤ آ کر بس گیا۔ یہ بھی ایک
اتفاقیہ امر تھا۔ شروع شروع کے دو سال تو میں نے بنارس جیسے
قدامت پسند شہر میں گزارے تھے۔ جہاں میرا جی بالکل نہیں لگتا
تھا۔ جی لگتا بھی کیسے؟ وہاں لاہور جیسا نہ تو ادبی ماحول تھا نہ ہی
اس شہر جیسی خوب صورتی، کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے کے لیے
ویسے ریستوران بلکہ ڈھابے تک نہیں تھے۔ دونوں شہروں کے
کپڑے وغیرہ پہننے کے علاوہ مجلسی آداب میں بھی بہت فرق تھا۔
مجھے یاد ہے شام ہوتے ہی میں اداس ہو جاتا تھا۔ لوگ عام طور پر
جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے ایک دوسرے سے سڑکوں
کے کنارے کسی پان کی دکان پر ہی ملنا پسند کرتے تھے اور وہیں
کھڑے کھڑے علم و ادب اور سیاست پر لمبی لمبی گفتگوئیں کر کے
مطمئن ہو لیتے تھے۔ ایک دوسرے کے گھروں پر جہاں سختی سے
پردہ روا رکھا جاتا تھا پان سپاری سے ایک دوسرے کی خاطر تواضع
کرنے کو اعلیٰ آداب میں شمار کیا جاتا تھا۔ چائے کا تو شاذ و نادر
ہی کہیں پوچھی جاتی تھی۔"

(رام لعل: کوچۂ قاتل: صفحہ 207: لکھنؤ 1993)

رام لعل کے یہاں یکے بعد دیگر تین بچے پیدا ہوئے۔ سب سے پہلے 28/نومبر 1946 میں ان کے یہاں ایک بیٹی کی ولادت ہوئی جس کا نام شیل رکھا گیا۔ شیل کی پیدائش اپنے آبائی شہر میانوالی میں ہوئی تھی۔ شیل اردو نوشت و خواند سے بخوبی واقف ہے۔ اس کے بعد ان کے یہاں ایک بیٹے کا جنم ہوا جو تقسیمِ وطن کے بعد 2/دسمبر 1949 کو انبالہ میں پیدا ہوا تھا۔ جن کا نام ونود ہے۔ وہ عرفِ عام میں ویرونود چھابڑا نام سے مشہور ہے اور لکھنؤ میں ہی سکونت پذیر ہے۔ رام لعل کی تیسری اور آخری اولاد ایک بیٹی کرن ہے جو 29/ستمبر 1952 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئی۔ شیل کے علاوہ رام لعل کے یہ دونوں بچے بھی اردو زبان سے کسی حد تک

واقفیت رکھتے ہیں۔

رام لعل کی ملازمتی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ رام لعل محکمۂ ریلوے سے 1938 میں وابستہ ہوئے تھے، جہاں میکینکل ورکشاپ میں اپرینٹس کی حیثیت سے ان کا داخلہ ہوا تھا۔ وہاں سے تربیت حاصل کرنے کے بعد 1941 میں انھیں مشین مین کی حیثیت سے ملازمت ملی، لیکن چند مہینوں بعد وہاں سے مستعفی ہو گئے اور اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے کی کوشش کی۔ بڑی آرزوؤں اور امیدوں کے ساتھ چھابڑا برادرس کے بینر سے سائیکلوں کی ایک دکان قائم کی۔ لیکن سال سوا سال کے بعد پھر ٹائپسٹ کی حیثیت سے نظام آباد کے سب ڈپو میں ملازمت کی۔ چند مہینوں بعد اسے چھوڑ کر نارتھ ویسٹرن ریلوے کے ٹریننگ اسکول میں کمرشیل کلرک بن گئے۔ بعد میں انڈین ریلوے کے محکمے ہی میں مختلف اسامیوں پر کام کرتے رہے۔ کبھی پارسل کلرک رہے، کبھی گڈس کلرک۔ بعد ازاں کلیم انسپکٹر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ اور بالآخر 31/ مارچ 1981 کو ریلوے کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔

ریلوے کی ملازمت میں رام لعل کو خواص اور عوام دونوں ہی سے قربت کے مواقع حاصل ہوئے۔ اس طرح وہ جہاں عوامی مسائل و معاملات سے واقف رہے، وہیں خواص کی طرزِ زندگی سے بھی انھیں آگاہی حاصل کرنے کے مواقع ملے۔ اس طور رام لعل کی زندگی ایسے تجربات سے دوچار ہوئی جو کسی بھی حساس افسانہ نگار کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ اسی ملازمت کے طفیل میں انھوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں اور بیرونِ ملک کے لاتعداد سفر بھی کیے۔ ادبی پروگراموں میں تواتر کے ساتھ شرکت کرتے رہے اور کئی یادگار سفرنامے بھی رقم کیے۔ جو اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ثابت ہوئے۔

رام لعل نے جن بیرونی ممالک کے ادبی پروگراموں میں شرکت کی، ان میں پاکستان، انگلینڈ، فرانس، سوویت روس، مغربی جرمنی، سوئٹزر لینڈ، ڈنمارک، سوئڈن اور ناروے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ رام لعل کو ان کی ادبی خدمات پر بہت سے اعزازات اور انعامات بھی ملے۔ جن کی فہرست خاصی طویل ہے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد رام لعل نے اپنی بقیہ زندگی صرف اور صرف ادبی

کاموں کے لیے وقف کر دی تھی اور اخیر عمر میں بھی نوجوانانہ جوش وخروش کے ساتھ ہمہ وقت علمی اور ادبی کاموں میں مصروف رہے۔

1993 کا سال رام لعل کے لیے کچھ پریشانیاں لے کر آیا۔ یہ سال بہ لحاظِ صحت ان کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوا۔ ماہِ مئی کے وسط میں ان کے گردے میں کوئی خرابی رونما ہوئی۔ تو انھوں نے بغرضِ علاج ایک بڑے شفاخانے سے رجوع کیا۔ جہاں تشخیص کے دوران پتہ چلا کہ ان کا وزن غیر معمولی طور پر روز بروز گھٹتا جا رہا ہے۔ سابق میں ان کا وزن بہتر سے پچھتر کلوگرام رہا کرتا تھا۔ لیکن وہ اب گھٹتے گھٹتے صرف چالیس کلوگرام رہ گیا تھا۔ مختلف قسم کے معائنے کیے گئے اور جب ان کی رپورٹ سامنے آئی تو پتہ چلا کہ رام لعل کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو چکے تھے۔ اہلِ خانہ ان کا آپریشن کرانے کے لیے تیار تھے۔ لیکن بلڈ پریشر اور چند دیگر نزاکتوں کے پیشِ نظر ڈاکٹروں نے ان کا آپریشن نہ کرنے کی صلاح دی۔

وہ اپنے علاقے کے سب سے بڑے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں دو تین ہفتوں تک رہنے کے بعد اپنے گھر واپس آ گئے اور ایک ماہر ہومیو پیتھ سے علاج کرانا شروع کر دیا۔ جسمانی کمزوری کی وجہ سے رام لعل چھڑی کے سہارے چلنے لگے۔ لیکن ذہنی الجھنوں کی وجہ سے دو تین ماہ کے بعد چھڑی کو خیر آباد کہہ کر اپنے بل پر چلنے لگے۔ کیونکہ چھڑی لے کر چلنا انھیں خلافِ مزاج معلوم ہوتا تھا۔ بیماری اور کمزوری کے خلاف سنگھرش کرتے ہوئے اور اپنی قوت ارادی کو برقرار رکھتے ہوئے رام لعل زیست کرتے رہے۔ اسی سال یعنی 1993 ہی میں ان کے ادبی سفر کی نصف صدی مکمل ہو چکی تھی۔ اس موقع پر لکھنؤ کی ادبی تنظیموں کے تعاون سے اردو سماج نے ایک زبردست جشن کا اہتمام کیا اور حبیب اللہ اسٹیٹ میں لکھنؤ اور بیرونِ لکھنؤ کے لاتعداد اہلِ قلم اور پرستارانِ رام لعل نے شرکت کی۔ اس جشن میں پچاس سے زائد ادبی انجمنوں کی طرف سے ان کی گل پوشی کی گئی اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں سپاس نامہ اور تحائف پیش کیے گئے۔ رام لعل ان خوش نصیب قلم کاروں میں سے ہیں جن کی اہمیت وعظمت کو ان کی زندگی میں ہی تسلیم کر لیا گیا۔

رام لعل نے اگلے ڈھائی تین برس زیست وموت کی کشمکش میں گزارے۔ ذہنی و جسمانی طور پر بڑی صعوبتیں برداشت کیں اور بالآخر 16/اکتوبر 1996 کو اپنا تاریخ ساز

رول انجام دے کر اس جہانِ آب و گل سے رخصت ہوئے۔ ان کے انتقال سے شہر لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ کچھ دنوں نوحہ و ماتم ہوا کیا اور آخر کو سب صبر کر کے بیٹھ گئے کہ دنیا کی یہی ریت ہے۔ تاہم اردو ادب میں ان کا نام اور کام آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ادبی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔

ادبی زندگی کا آغاز

یوں تو رام لعل نے 1940 کے بعد اپنی افسانہ نگاری کا آغاز کر دیا تھا، جس کا ذکر انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''کوچۂ قاتل'' میں خاصی تفصیل سے کیا ہے اور ان کا اپنے زمانے کے جدید تخلیقی ادب کے مطالعے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اُس زمانے کے بے شمار لکھنے والوں میں انھیں جو افسانہ نگار زیادہ پسندیدہ معلوم ہوتے تھے، ان کا ذکر رام لعل بڑی جذباتیت اور بڑے احترام کے ساتھ کرتے ہوئے ان کے نام اس طرح گنواتے تھے۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی اور عصمت چغتائی۔ ان میں بھی وہ کرشن چندر، بیدی اور منٹو کو اولیت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تیسری دہائی کے جدید اردو افسانے کے یہی حقیقی معمار قرار دیے جا سکتے ہیں۔ رام لعل کا پہلا افسانہ بعنوان ''تھوک'' 1943 کے ہفت روزہ ''خیام'' لاہور میں شائع ہوتا ہے۔ یہ بھی اغلب ہے کہ انھوں نے 1940 سے 1943 کے تین سال کے عرصے میں کچھ ایسی تخلیقات بھی رقم کی ہوں گی جو یا تو شائع نہیں ہوئیں یا پھر اگر چھپی بھی ہوں گی تو بہت ہی غیر اہم یا مقامی اخباروں یا رسالوں میں، جنھیں رام لعل بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایسے اخبارات میں ہفت روزہ 'فلم اسٹار و بلکلی' لاہور اور ہفت روزہ 'گرو گھنٹال' لاہور کا ذکر وہ سرسری طور پر ہی کرتے ہیں۔ جن کا ریکارڈ نہ ان کے پاس موجود رہا تھا نہ ہی ہندوستان کی کسی لائبریری میں ملتا ہے۔ دراصل یہ کام مزید تحقیق چاہتا ہے جو لاہور کے گزیٹر میں ہی ملنا ممکن ہو سکتا ہے۔

لیکن چونکہ رام لعل خود اپنی اولین کہانی کی اشاعت رسالہ ''خیام'' لاہور میں ''تھوک'' کو قرار دیتے ہیں۔ اس لیے ہم اسی کو تسلیم کر کے ان کے اوائل عمری کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا جانا مناسب تصور کرتے ہیں۔

رام لعل کے بقول ان کے افسانے ''تھوک'' کے بارے میں ہفت روزہ ''خیام'' کے مدیر شیلی بی۔ کام۔ نے ایک تعریفی نوٹ اسی اشاعت میں لکھا تھا جس میں انھوں نے نہ صرف افسانے کو ایک حیرت ناک کلائمیکس سے ہمکنار قرار دیا تھا بلکہ انھوں نے بالکل نوآموز افسانہ نگاروں میں رام لعل کی آمد کا خیر مقدم بھی کیا تھا۔ چنانچہ ان کا یہ پہلا افسانہ بحث اور توجہ کا موضوع بن گیا تھا اور اسے قمر تسکین نے اپنے انتخاب ''خوشبوئیں'' میں بھی شامل کر لیا تھا۔ جو ''نئے زاویے'' مرتبہ کرشن چندر کی طرز کی ایک اینتھالوجی تھی۔

رام لعل کے افسانے 1943 اور 1944 میں ادبی رسائل میں بڑی باقاعدگی سے چھپنے لگے تھے جن میں ان کا ایک اور افسانہ بعنوان ''جلن'' ماہنامہ ''شاہکار'' لاہور میں چھپا تھا، جس کے مدیر اس زمانے کے ایک معروف افسانہ نگار شیر محمد اختر تھے۔ یہاں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 1944 میں ہی مرتب ہوا اور 1945 میں اسے ایسٹرن آرٹس اکیڈمی لاہور نے شائع کیا تھا۔ اس مجموعے میں اس زمانے کے مشہور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کا لکھا ہوا تعارف بھی شامل ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اس مجموعے کے مصنف کا نام اس قدر سیدھا سادہ ہے کہ آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں (گے) اور پوچھیں گے کہ کیا ادیبوں کے نام اتنے ہلکے پھلکے ہوتے ہیں اور پھر خاص کر اردو کے ادیبوں کے۔ نام کی سادگی کے علاوہ آپ کو ایک اور بات بھی کھٹکے گی اور آپ معاً پوچھیں گے اچھا یہ رام لعل بھی کوئی افسانہ نگار ہیں؟ ہم نے تو ان کا نام پہلے کبھی نہیں سنا۔''

احمد ندیم قاسمی کے ان ارشادات سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اس وقت رام لعل افسانہ نگاری کے میدان میں ہی نہیں بلکہ اردو ادب میں بالکل نو وارد تھے اور انھیں اپنے آغاز سفر سے ہی احمد ندیم قاسمی جیسا رہنما مل گیا تھا جنھوں نے اس کتاب کے اسی تعارف میں آگے چل کر

لکھا ہے:

''رام لعل واقعی بہت اچھا افسانہ نگار ہے۔.....ایک روز میں ایک خاص کتاب کی تلاش میں تھا کہ یہ مسودہ نظر پڑا۔ پہلے افسانے کی ابتدائی سطریں ہی پڑھی تھیں کہ میں چونکا اور افسانے کی آخری سطر پڑھ کر اٹھا۔ مجھے جو چیز رام لعل کے افسانوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور اچھوتی معلوم ہوئی وہ اس کا شدید احساس ہے۔ یہ احساس اس قدر صاف اور صحت مند ہے کہ رام لعل اس ضمن میں انفرادی حیثیت کا مالک ہے۔''

اس مجموعہ کا پہلا افسانہ ''تھوک'' ہی ہے جس کی ابتدائی سطریں اس طرح ہیں:

''فوجی ریسٹورینٹ کے قریب ہیرا کھڑا ہنس رہا تھا۔ جیب میں ایک اٹھنی تھی۔ چاندی کی گول مول اٹھنی۔ انگلیاں ٹٹول رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اس کی ہنسی اپنا اصلی رنگ کھو بیٹھی۔ بھکارن کو چھیڑتا دیکھ کر ہنس کر اسے شہ دی تھی۔ انھیں ہنستا دیکھ کر اس کے ہونٹ بھی وا ہو گئے۔ ہنسی جیسے رال بن کر بہنے لگی۔''

(''تعارف'' از احمد ندیم قاسمی ''آئینے'' مصنفہ رام لعل، لاہور، 1945)

یہ افسانہ دراصل لاہور کی ایک معروف سڑک پر دو دوستوں کی آوارہ گردی کا بیانیہ ہے۔ دونوں دوست نوعمر ہیں اور سنیما گھروں اور دیگر تفریح گاہوں پر مٹر گشتی کرتے ہیں۔ ان کی جیب میں زیادہ پیسے بھی نہیں۔ بے روزگاری کے کرب میں مبتلا یہ دونوں نوعمر لڑکوں کی توجہ کا مرکز ایک برقع پوش بھکارن بن جاتی ہے۔ جو مختلف لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کر مختلف بہانوں سے بھیک مانگتی پھرتی ہے۔ کبھی اپنی بھوک کی فریاد، کبھی بیٹی کی موت کا المیہ اور کہیں سمندر پار جنگ میں اپنے شوہر کی گمشدگی کا ذکر۔ دونوں لڑکے اس عورت کو اپنے جیب میں رکھی واحد اٹھنی دینے کا لالچ دے کر اپنی قیام گاہ پر لے آتے ہیں اور جب وہ عورت برقع اتار دیتی ہے تو وہ ایک کالی کلوٹی

ادھیڑ عمر کا پیکر ثابت ہوتی ہے جسے دیکھ کر نوجوانوں کے احساس جمالیات کو شدید ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ اس کی طرف اٹھنی پھینک کر اسے وہاں سے بھگا دیتے ہیں۔

اس مجموعے میں رام لعل کا ایک اور افسانہ ''یہ شارع عام نہیں'' قابل توجہ ہے جو ایک نوجوان لڑکے کی دلسی ہی مٹر گشتی کی روداد ہے۔ وہ گھومتے گھومتے لارنس گارڈن میں انگریزوں کے ایک کلب کے قریب جا پہنچتا ہے جہاں ہندستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ اس میں رام لعل نے لکھا ہے:

> ''انگریز عورتیں اور مرد بانہوں میں بانہیں ڈال کر ناچ رہے تھے۔ باجہ بج رہا تھا۔ کئی ایک طرف بیٹھے وسکی پی رہے تھے اور جھوم رہے تھے۔ للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بیرے خدمت بجا رہے تھے اور چوکیدار آس پاس پہرا دے رہے تھے۔ چوکیدار اسے وہاں سے بھگا دیتا ہے۔ اس پر نوعمر لڑکا برافروختہ ہو کر کہہ اٹھتا ہے اُلو کا پٹھا۔ تو ہندستانی ہی نہیں، کمینہ بھی ہے۔ کتا ہے۔ یہ دیکھ میری جیب میں دو روپے ہیں تو دیکھ دیکھ کر ترستا ہے اور اپنے آپ کو مطمئن سمجھتا ہے میں ابھی جا کر ایک عورت کے ہونٹ، بال، رُخسار، اور ساری عورت خرید سکتا ہوں۔ تو کیا کر سکتا ہے؟''
>
> (''یہ شارع عام نہیں'' مشمولہ 'آئینے'' مصنفہ رام لعل، لاہور، 1945)

ایک اور افسانہ اسی مجموعے میں ''فرار'' کے نام سے شامل ہے جس میں انگریزوں کے عہد حکومت میں ایک نوعمر لڑکا جو ایک ریلوے ورک شاپ کے اندر آگ کی دہکتی بھٹیوں کے پاس روزانہ نو گھنٹے کام کرتا ہے لیکن وہ ملنے والی اجرت سے سخت غیر مطمئن ہے کیونکہ اس سے وہ روٹی، کپڑا اور مکان کی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتا۔ اچانک دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے اسے فوج میں بھرتی ہو کر ہندوستان سے بھاگ جانے کا موقع مل جاتا ہے۔

رام لعل کی کہانی ''جلن'' مغربی پنجاب کی ایک خاص تہذیب کی عکاسی ہے جس میں نچلے متوسط مسلم معاشرے میں شادی اور لڑکیوں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ اور حسد کی ایک دھیمی دھیمی

آنچ ملتی ہے۔ دیگر کہانیوں میں بھی جو اس مجموعے میں شامل ہیں جیسے ''بے روزگاری''، ''مفلسی'' میں سماجی سطح پر نابرابری اور جنسی ناآسودگی کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے احمد ندیم قاسمی نے ان کے تعارف میں لکھا:

> ''ان افسانوں میں نئی تکنیک کے تمام لوازمات موجود ہیں رام لعل پلاٹ کا بہت زیادہ قائل نہیں معلوم ہوتا لیکن وہ پلاٹ کی اہمیت سے بے خبر بھی نہیں۔ ایک ننھی سی بات، ایک زرہ سا واقعہ اس کے حساس دل میں تھرتھراہٹ سی پیدا کر دیتا ہے اور وہ اپنی دیہاتی ذہنیت اور تعلیم یافتہ ماحول کے پس منظر پر پیاری اور خوب صورت تصویر اُتار لیتا ہے۔ اس تصویر کا ایک ایک خط، ایک ایک خم سحر انگیز ہوتا ہے۔ رنگ آمیزی میں بھی اسے کافی دسترس حاصل ہے۔ اگر اس کی زبان زرہ زیادہ صاف ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ اس کی یہ کہانیاں اردو ادب میں ایک بالکل نئے اور اچھوتے دور کا آغاز ہوتیں۔ اگرچہ اب بھی ان میں اتنی خوبیاں موجود ہیں کہ زبان کی لغزشیں قبول کی جاسکتی ہیں۔ رام لعل کا انداز تحریر مفکرانہ ہے۔ زندگی کے اس گرجتے دھارے میں اس کی تیز نگاہ ایک بے مایہ تنکے کو بھی دیکھ اور پرکھ سکتی ہے۔ وہ کف آلود لہروں میں گھری ہوئی چٹانوں کی طرف اتنا متوجہ نہیں جتنا بلبلوں، تنکوں اور گردابوں کی طرف۔ وہ نقاش بھی ہے اور عکاس بھی۔ وہ ذہنی تصویریں بھی تیار کر سکتا ہے اور کائنات میں بکھری ہوئی بے شمار تصویروں کا فوٹو بھی اتار سکتا ہے۔ وہ سوچتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے۔ یہی خوبی ہے جو اس کی کہانی کو زندہ رکھے گی۔ کیونکہ بصیرت اور بصارت اگر الگ الگ ہو کر کام کریں تو زندگی زندگی نہیں رہتی۔''

(''تعارف'' از احمد ندیم قاسمی، افسانوی مجموعہ ''آئینے'' مصنفہ رام لعل، لاہور، 1945)

رام لعل کی افسانہ نگاری کے اولین دور کا دوسرا قابل ذکر مجموعہ ''انقلاب آنے تک'' کے عنوان سے آزادی کے بعد 1949 میں انٹرنیشنل پبلشرز، بنارس کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس زمانے میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ آزادی اپنے ساتھ فسادات کا ایک المناک سلسلہ لے آئی تھی۔ قومی سطح پر تعمیر و تشکیل کا ایک خواب سامنے رکھ دیا گیا تھا لیکن اس کی تعبیر میں شکست و ریخت، نا آسودگی اور نا امیدی بھی موجود تھی۔ اسی کتاب میں شامل کرشن چندر کے ان جملوں کو رام لعل اپنے لیے رہنما اصول کے طور پر برتتے اور قبول کرتے ہیں:

> ''..... ہر شخص زندگی کے موڑ پر سے گزرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس لیے غم کھانے سے کچھ نہ ہوگا۔ اپنی زندگی کو دوسروں کے لیے بہتر بنایئے اور آنسوؤں کے کسی ایک قطرے کو بھی بیکار نہ جانے دیجیے۔ پیٹ کے دھندے سے ڈرنا غیر افادی ہے۔ غذا زندگی بخشتی ہے اور زندگی بڑی مقدس شے ہے۔ اس لیے جسم و جان کو ایک رشتے میں جوڑنے کے لیے ہم جو تگ و دو شب و روز کرتے ہیں۔ وہ بھی مقدس ہے اور قابل احترام.....''
>
> (اقتباس از کرشن چندر، مشمولہ ''انقلاب آنے تک'' مصنفہ رام لعل، بنارس 1949)

رام لعل کے اس افسانوی مجموعے کا دیباچہ قاضی محمد عبدالغفار، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو، ہند نے لکھا تھا۔ جس میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''رام لعل کے افسانوں کو پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ انھوں نے عوامی زندگی کے بعض پہلوؤں کو خاص طور پر چن لیا ہے۔ اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے آرٹ کی روشنی میں ان حقائق کو نمایاں کریں۔ ادب کے جدید دور میں یہی راستہ صحیح ہے اور یہی راستہ عوام کی خدمت کا راستہ ہے۔ ان افسانوں میں رام لعل صاحب کے سوچنے کا جو انداز نظر آتا ہے وہ یقیناً ترقی پسند آرٹ کا انداز ہے اور اس میں تجریدی ترقی کے لیے بہت وسیع میدان موجود

ہے۔ ادیب اور آرٹسٹ خود اپنے قلم سے اپنے لیے فکر اور نظر کا میدان صاف کر لیتا ہے اور اس لیے مجھے یقین ہے کہ رام لعل صاحب جس سمت میں جا رہے ہیں۔ اس میں ان کے لیے ادب کے ترقی پسند عناصر روز بروز نمایاں ہوتے جائیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ ترقی پسندی اور آرٹ کا ربط قائم نہ رہے۔ اس قسم کے ادب کا کمال وہی ہے کہ آرٹ اور ترقی پسندی اور حقیقت نگاری کا توازن قائم رہے۔ بعض لکھنے والے اپنے ادب کو زندگی سے بہت قریب لے آتے ہیں لیکن ان کے ادب کا آرٹ۔ پیچھے رہ جاتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ آرٹ کی تمام خوبیوں کے بغیر ادب کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے۔''

(اقتباس از دیباچہ از قاضی محمد عبدالغفار، مشمولہ ''انقلاب آنے تک'' مصنفہ رام لعل، بنارس 1949)

رام لعل نے خود بھی اپنے افسانوں کے ایک مجموعے بعنوان ''وہ مسکرائے گی'' میں جو 1952 میں چندن بک ڈپو، دہلی سے شائع ہوا تھا ترقی پسندی کی بھیڑ چال سے انحراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ میرے ان دوستوں کی حد درجہ تنگ نظری تھی کہ اس وقت وہ ہر چیز کو سرخ عینک لگا کر پرکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ ان کے نزدیک ہر وہ چیز ٹھکرا دینے کے قابل تھی جس میں سے ایکسرے کرنے کے بعد سرخ جراثیم دکھائی نہ دے سکیں۔ گزشتہ چند برسوں کا یہ سرخ ادبی تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ سرخ انقلاب کے کھوکھلے پروپیگنڈے نے ایک بھی اچھا افسانہ تخلیق نہیں ہونے دیا۔''

(''دیباچہ'' ''وہ مسکرائے گی'' مصنفہ رام لعل، دہلی، 1952، صفحہ 7)

رام لعل کے اپنے دیباچے میں لکھے ہوئے یہ جملے اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ ادب میں ترقی پسند مضمرات کا تو پورا احترام کرتے ہیں لیکن وہ فن کا دامن بھی ہاتھ سے چھوڑنے کے لیے

تیار نہیں ہیں۔ رام لعل کے نظریۂ فن کی غماض ان کی لگ بھگ پچاس برس تک لکھی ہوئی وہ تمام کہانیاں ہیں جن کو ترقی پسندوں اور جدید ادب کے حامیوں نے یکساں طور پر اپنے اپنے نظریات کی کسوٹی پر پرکھا اور دیکھا ہے۔

''انقلاب آنے تک'' عنوان ہی اس بات کا شاہد ہے کہ انقلاب ابھی دور ہے لیکن اس کی راہ میں بے شمار مسائل، بے شمار کھائیاں اور دشوار گزار پہاڑ آتے ہیں جن کا سامنا کرنا رام لعل ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا یہ مجموعہ زیادہ تر آزادیٔ ہند کے بعد تقسیمِ وطن کے نتیجے میں برپا ہونے والے فسادات کے بارے میں لکھے ہوئے افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان فسادات کو رام لعل نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جھیلا اور ہزاروں لاکھوں مہاجروں کی طرح سرحد کو پار کیا تھا۔ نئے ہندستان میں پہنچ کر بھی انھوں نے اپنا ذہنی توازن نہیں کھویا اور ایک مثبت انداز میں فسادات کا معاشی اور سماجی تجزیہ پیش کیا۔ اس مجموعے میں شامل ایک افسانہ ''ایک عورت تھی علاجِ غمِ دنیا تو نہ تھی'' میں وہ اس طرح لکھتے ہیں:

> ''امرتسر پہنچ کر اس کا سفر ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ یہاں سے ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا تھا جو پہلے سفر سے زیادہ طویل کڑیل اور صبر آزما تھا۔''
>
> ''پھر تم جانتی ہو پاکستان کیسے بنا؟ فسادات کیسے ہوئے؟ لوگ کیوں کر مرے؟ عورتیں کہاں کہاں اٹھائی گئیں؟ اور معصوم بچے کس طرح نیزوں پر اچھالے گئے تمھارے اپنے شہروں امرتسر، جلندھر، لدھیانہ اور دہلی میں بھی تو ایسے واقعات رونما ہوئے تھے اور تمھیں اچھی طرح یاد ہوگا۔ ٹھیک اُسی طرح اِدھر بھی ایسے ہی گُل کھلائے گئے تھے اور اس بھیانک جھگڑ کے دوران میں میری ویراں بھی اٹھائی گئی۔ میں تب گاؤں میں نہ تھا۔ شہر میں تھا وہاں چنگی کا محرر تھا۔ گاؤں میں فساد ہوا تو شہر میں بھی فساد ہو گیا۔ پھر میں گاؤں میں واپس نہ جا سکا..... مجھے وہیں شہر کے ایک کیمپ میں پناہ ملی اور وہیں کیمپ میں رہنے کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے گاؤں میں

سے دس اور تیس سال کے درمیان کی عمر کی عورتوں کو زندہ چھوڑا گیا
اور ان کو بھی گرم جلتی ہوئی ریت کے ٹیلوں پر ننگا کر کے بھیڑ بکریوں
کی طرح آپس میں بانٹ لیا گیا۔ اور پھر ان کے ساتھ زنا کیا گیا
جیسے اچانک ان پر جنت سے حوریں برس پڑی ہوں۔''

(افسانہ ''ایک عورت تھی علاجِ غمِ دنیا تو نہ تھی''، مشمولہ ''وہ مسکرائے گی'' مصنفہ رام لعل، دہلی، 1952)

اسی افسانے میں رام لعل نے امرتسر میں ایک مسلمان عورت کے ساتھ ہوئے اجتماعی زنا بالجبر کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

''کمرے کے ایک کونے میں چھوٹا سا دیا ٹمٹما رہا تھا اور
وسط میں کوئی شخص لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ میں فوراً کچھ نہ سمجھ
سکا۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس کے نزدیک گیا تو میری روح
سینے میں سے کھسک کر جانے کہاں لٹک گئی۔ میری آنکھوں کے آگے
بہت سے مدھم چراغ اور ننگی ٹانگیں جھلملانے اور گھومنے لگیں۔ ایک
عورت - پوری عورت بالکل عریاں اسی طرح چپ چاپ لیٹی ہوئی
تھی۔ جیسے کسی مندر کے باہر چندہ ڈالنے کی صندوقچی درمیان میں
رکھ دی جاتی ہے۔ وہ رنڈی نہ تھی۔ فاحشہ نہ تھی۔ کسی شریف مسلمان
گھرانے کی عصمت مآب عورت ہوگی۔ ایک ماں، ایک بہن، ایک
بیٹی، ایک بیوی؛ جس کی پاکیزگی اور عظمت بھگوان کے مندر کی طرح
بلند اور مسلّم تھی۔ لیکن وہ ننگی پڑی تھی۔ ایک واضح اور کھلے مقصد کے
لیے اسے اس حالت میں لٹا دیا گیا تھا۔ اس کے منہ سے کف اور قے
بہہ بہہ کر اس کی گردن پر پڑ رہی تھی۔ اس کے پستانوں، گالوں،
رانوں اور پیٹ پر دانتوں کے کاٹنے اور ناخنوں کی خراشوں کے
نشانات تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ
گیا۔ وہ چپ چاپ میری طرف تکتی رہی۔ میں نے پھٹے ہوئے

کپڑے کے ٹکڑے سے جو مجھے اندر داخل ہوتے وقت دیا گیا تھا اس کے منہ سے بہتی ہوئی کف پونچھی۔ اس کے جسم کے زخم صاف کیے اور پھر اس کے نیچے پڑے ہوئے گرد آلود ٹاٹ کو کھینچ کر اس کے جسم پر ڈال دیا۔ اور کہا ماں!''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسی طرح چپ چاپ میری طرف دیکھتی رہی۔ لیکن اب اس کی آنکھوں میں قدرے حیرانی کی بجلی سی کوندتی تھی۔ میں نے پھر کہا ''ماں..... بولو اس موقع پر میں کیا کروں۔ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ ہنس پڑی۔ طنز بھری ہنسی! بولی ''جو دوسرے باری باری آ کر جاتے ہیں وہی تم بھی کرو اور چلے جاؤ۔ اور کسی اور کو اندر آنے دو۔''

''خاموش رہو ماں..... تم یقیناً حواس کھو چکی ہو۔ مجھے بتاؤ تمھارے پاس کوئی چاقو یا چھری ہے.....؟'' یہ کہتے ہوئے یکبارگی میرے ذہن میں ایک تیز چمک پیدا ہوئی۔ اس نے پوچھا۔

''کیوں..... کیا کرو گے؟''

اس سے تمھیں ہلاک کروں گا۔ میں تمھیں اس ذلت آمیز مسلسل عذاب سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔''

وہ ہنس پڑی۔ میرے پاس چھری ہوتی تو کیا میں اب تک زندہ ہوتی۔ میں نے خودکشی نہ کر لی ہوتی۔؟''

یہ سن کر میں جلدی سے اٹھا اور اس کی گردن پر دونوں ہاتھ رکھ دیے اور پوچھا..... تم مرنے کے لیے تیار ہو نا.....''

(افسانہ ''ایک عورت تھی علاج غم دنیا تو نہ تھی'' مشمولہ ''وہ مسکرائے گی'' مصنفہ رام لعل، دہلی، 1952)

فسادات کے موضوع پر اس مجموعے میں رام لعل کے دو افسانے ''بھیڑیے'' اور

''کھیتوں کی رانی'' بھی شامل ہیں۔لیکن رام لعل کے پیش نظر فسادات اور ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ کچھ اور مسائل بھی تھے جنھیں انھوں نے برسوں بعد تک ایک نئے تجزیاتی انداز سے لکھا۔ جو لوگ بے خانماں و برباد ہوکر پاکستان سے ہندوستان پہنچے۔ان کے سامنے نوآبادکاری کی بھی مشکلات تھیں اور اپنے کھوئے ہوئے وطن کی یادوں کو بھی وہ اسی طرح سے محو نہیں کر سکتے تھے۔نئی سرزمیں پر پہنچ کر ان کے طرزِ معاشرت میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں جن کا سلسلہ نئی نسلوں تک پہنچتا ہے۔ان سب کا احاطہ رام لعل نے اپنے چند مشہور و مقبول افسانوں ''اکھڑے ہوئے لوگ''، ''قبر''، ''اندھیرے میں کھوئی ہوئی صلیب''، ''تلاش گمشدہ''، ''نصیب جلی''، ''ایک ہزار بچوں والی ماں''، ''نئی دھرتی پرانے گیت''، ''زہر تھوڑا سا''، ''ایک شہری پاکستان کا'' اور ''شگن'' وغیرہ میں بڑی خوبی اور فن کاری سے کیا ہے۔کسی بھی ملک میں جب تاریخ کے فیصلے کے مطابق ایک بہت بڑی ہجرت کا عمل شروع ہوتا ہے تو اس کے اثرات چند برسوں میں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ ذہنی طور پر ایسی نسلیں صدیوں تک زمین و آسمان کے درمیان معلق رہ جاتی ہیں۔رام لعل نے اسی نقطۂ نظر سے تقسیم ہند سے پیدا شدہ حالات پر ایک مفکرانہ طرز اظہار اپنایا اور مذکور بالا افسانوں میں سے کچھ ایک کو تو اردو ادب کا قابل قدر اور یادگار تخلیقی سرمایہ بنا دیا۔

رام لعل کے افسانوں کا ایک اہم ترین مجموعہ ''نئی دھرتی پرانے گیت'' کے عنوان سے 1958 میں مکتبہ فکرِ جدید، لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔جس نے انھیں آزادی کے بعد ابھرنے والے چند اہم ترین افسانہ نگاروں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا تھا۔اس مجموعے کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے:

> ''رام لعل اردو کے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کی نظر کی صحت اور فن کی پختگی اب اردو دنیا میں تسلیم کی جا چکی ہے۔ میں نے ان کے افسانے سنے بھی ہیں اور پڑھے بھی۔ان افسانوں میں حقیقت نگاری کے ساتھ حسن اور فن کے التزام کے ساتھ فکر کی گہرائی ہے۔انھوں نے زیادہ تر انہی موضوعات کو لیا ہے جن سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔اس واقفیت کی وجہ سے ان کے افسانوں میں جان ہے۔ رام لعل کے افسانے دل میں خاموش خلش پیدا

کرتے ہیں۔ ان میں آج کے انسانوں کی مظلومیت اور انسانیت سے محبت دونوں کا عکس ملتا ہے۔ شروع میں مواد ان پر سوار تھا۔ اب وہ مواد کی ترتیب اور تہذیب پر قابو پا گئے ہیں اور اپنے افسانوں کے ذریعے سے جدید اردو ادب کی آرائش وزیبائش میں مصروف ہیں۔''

(مضمون پروفیسر آل احمد سُرور، افسانوی مجموعہ ''نئی دھرتی پرانے گیت'' مصنفہ رام لعل، مطبوعہ مکتبہ فکرِ جدید، لکھنؤ، 1958)

رام لعل چونکہ محکمہ ریل سے وابستہ رہے اس لیے انھیں اس محکمے کے مختلف نوع کے افراد کے علاوہ عوام وخواص کو بھی بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملتے رہے۔ رام لعل نے نہ صرف یہ کہ ان کا مشاہدہ کیا بلکہ ان کی نفسیات کا بھی بہت گہرائی سے مطالعہ کیا اور انھیں اپنے متعدد افسانوں میں جب پیش کیا تو ایک زمانے میں چند نوعمر نقادوں نے ان پر ریل کا ٹھپہ بھی لگا دیا کہ وہ صرف اسی محکمے کے بارے میں افسانے لکھتے ہیں جبکہ یہ بات حقیقت سے دور تھی۔ ان کے پیش نظر پورا ہندستانی سماج تھا۔ انھیں اپنے افسانوں کے لیے جہاں کہیں قابل تخلیق مواد مل جاتا تو وہ اسے لکھے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن ان کے بارے میں ''نئی دھرتی پرانے گیت'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''رام لعل کے افسانے تعمیر وتشکیل کے اعتبار سے بڑے کامیاب ہیں۔ ان میں جہاں کہیں براہ راست تجربے کی تب وتاب آ گئی ہے وہاں ان کا حسن اور بھی نکھر گیا ہے۔ جنس جیسے خطرناک اور چونکا دینے والے موضوع پر بھی رام لعل نے سنجیدگی اور احتیاط کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ شرنارتھیوں کی زندگی اور ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی نفسیاتی کشمکش، ریلوے کالونی، ٹرین کے ڈبے اور گودام کے کاؤنٹر سے جھانکتے ہوئے انسانی چہروں کی سرگزشت رام لعل کے محبوب موضوع ہیں۔ وہ انھیں پوری نفسیاتی باریک بینی اور فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ اپنے خوب صورت افسانوں میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ رام لعل کے افسانے اردو افسانے کی قوس و

قزح کا ایک دلنواز اور رنگین جزو ہیں اور ان سے مستقبل کی بہترین
امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔''
(ڈاکٹر محمد حسن: ''نئی دھرتی پرانے گیت'' مصنفہ رام لعل، لکھنؤ،
1958)

رام لعل کے افسانے پڑھ کر نیاز فتح پوری جیسے بزرگ اور روایتی نقاد و افسانہ نگار کو بھی کہنا پڑا:

''یوں تو انسانی زندگی تمام تر افسانہ ہی افسانہ ہے اور حد
درجہ بے آب و رنگ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ جب کبھی اچھے
افسانہ نگار کا قلم اس کو چھو لیتا ہے تو اس کی تلخیاں بھی ہمیں گوارہ
ہو جاتی ہیں اور یہی وہ احساس و تاثر ہے جس پر جامع بشریت کی بنیاد
قائم ہے۔ رام لعل کا فن یہی ہے اور اس لیے وہ دلچسپ بھی ہے اور
کارآمد بھی''۔ (نئی دھرتی پرانے گیت)

رام لعل نے اپنے آغاز سفر سے ہی ایک طرف تو نہایت ہی سادہ نثر کو اپنایا۔ دوسری طرف عام لوگوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور محرومیوں کو پیش کرنے کی کوشش کی جنھیں عام طور پر بڑے افسانہ نگار یا تو نظر انداز کر دیتے ہیں یا ایسے وسیع کینوس پر رکھ کر پیش کرتے ہیں کہ وہ بے حد بوجھل قسم کا فلسفہ بن جاتا ہے۔ اس ضمن میں رام لعل نے چے خف اور موپاساں کو مثال بنایا اور جن مسائل پر انھوں نے قلم اٹھایا انھیں اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور اپنے قارئین کے دل و دماغ میں اسی گہرائی سے اتار دیا۔ اس بات کا اعتراف ان کے اسی مجموعے میں کرشن چندر جیسا قد آور افسانہ نگار اس طرح کرتا ہے:

''رام لعل کے افسانے چھوٹے چھوٹے ہندستانی
گھروں کے دکھ درد اور خوشیوں کے افسانے ہیں۔ یہ عوام کے
سیدھے سادے جذبات کے تانے بانے سے بُنے گئے ہیں۔ یہ
افسانے مرعوب نہیں کرتے، متاثر کرتے ہیں۔ ان میں گراں بار
الفاظ کی بوجھل ترکیبیں نہیں ہیں۔ سادہ رنگوں کی مصوری ہے۔ جو
دل کا لہجہ ان کی ادا ان کا پیرہن حقیقی زندگی سے مستعار ہے۔''

(کرشن چندر، دیباچہ، ''نئی دھرتی پرانے گیت'' مصنفہ رام لعل، لکھنؤ، 1958)

ڈاکٹر محمد حسن نے رام لعل کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے جنس سے متعلق ان کے چند افسانوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس ضمن میں ان کے ایسے کئی افسانوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ جو انھوں نے کسی حد تک سعادت حسن منٹو کے زیر اثر تخلیق کیے۔ لیکن ان کا موضوع و اسلوب، مسائل کی پیش کش اور فنی التزام ان کا اپنا ہے۔ انھوں نے اس موضوع کے بارے میں اپنے مجموعہ ''وہ مسکرائے گی'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

> ''جنسی طور پر ہمارے ہاں مرد اور عورتوں میں حد درجہ کی بے اطمینانی اور بے اعتدالی پائی جاتی ہے۔ اس کا تعلق بھی ہمارے سماجی نظام سے ہے۔ نفسیاتی علاج جو اس سلسلہ میں کیا جاتا ہے وہ بھی اپنی جگہ اہم ہے زندگی میں نفسیات کا بہت گہرا دخل ہے۔ کوئی ذرا سا واقعہ یا معمولی سی تبدیلی انسانوں کی زندگی کو دوزخ بننے سے بچالیتی ہے۔''
>
> (محمد حسن: ''دیباچہ''، افسانوی مجموعہ ''وہ مسکرائے گی'' مصنفہ رام لعل، دہلی، 1952)

رام لعل کے افسانوں میں ایسا کوئی بھی افسانہ نہیں ملتا جسے فحش نگاری سے تعبیر کیا جاسکتا ہو۔ انھوں نے جنس کو ایک سماجی اور انفرادی مسئلہ بنا کر پورے توازن و اعتدال کے ساتھ پیش کیا ہے جس کی مثال ''منجمد لمحے''، ''ملبہ''، ''فرضی آگ کی لَو''، وغیرہ سے دی جاسکتی ہے۔ رام لعل کے افسانوی سفر کا پہلا دور 1960 کے آس پاس ختم ہوتا ہے جس میں ان کے افسانوی فکر کے ابتدائی نقوش بھی مل جاتے ہیں اور پختہ کاری کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کے نشانات بھی نظر آتے ہیں۔

فنّی ارتقا

مابعد پریم چند اردو افسانہ نگاری کا دوسرا دور 1936 کے آس پاس شروع ہوتا ہے۔ اُس دور کے لکھنے والوں میں حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، اعظم کریوی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، اوپیندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس اور غلام عباس وغیرہ بے شمار نام شامل ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے آنے والوں میں جنھوں نے آزادی سے کچھ عرصہ قبل لکھنا شروع کیا لیکن آزادی کے فوراً بعد بہت نمایاں ہوکر ابھرے ان میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، رام لعل، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، ممتاز شیریں، جیلانی بانو، مہندر ناتھ، اقبال مجید، غیاث احمد گدی، جوگندر پال، دیوندر اسر اور اقبال متین وغیرہ کی ایک طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔ دراصل یہی وہ دور تھا جب نئے اردو افسانے نے صحیح معنوں میں اپنے پَر پُرزے نکالے۔ زندگی کے بے شمار مسائل کو اپنے اندر سمویا اور اردو افسانے کو ایک اعتبار اور وقار بخشا۔ اس میں شک نہیں کہ اردو افسانہ نگاروں کی مذکورہ بالا تیسری نسل کے افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ دوسری نسل کے افسانہ نگار بھی برابر لکھ رہے تھے۔ اور نئے افسانے کے وقار اور اعتبار میں اضافہ کرنے میں ان کا بھی بڑا ہاتھ رہا۔

رام لعل کی افسانہ نگاری کا آغاز 1943 میں ہوتا ہے جب اردو افسانہ اپنی زبان و بیان اور روایتی فنی رکھ رکھاؤ میں کچھ نئی تبدیلیاں لا رہا تھا۔ اگر ہم رام لعل کے اسی دور کے چند افسانوں کا

جائزہ لیں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ افسانے کی روایتی پلاٹ سازی یا ماجرا نگاری سے ہٹ کر اپنی ذاتی زندگی کے مشاہدات و تجربات کی مدد سے ایسے افسانے تحریر کر رہے تھے جنھیں رپورتاژ کے خانے میں بھی رکھا جاسکتا تھا اور نئے تجرباتی افسانے میں بھی ان کے افسانے ''تھوک''، ''چلتے چلتے''، ''یہ شارع عام نہیں''، ''فرار''، ''لاہور کی گاڑی''، وغیرہ اسی زمرے میں آتے ہیں۔

جن میں گرد و پیش کے مشاہدات کے علاوہ افسانوی مضمرات بھی موجود ہیں۔ ان کے اس دور کے افسانوں کے بارے میں پہلی بار اظہار خیال کرنے والے احمد ندیم قاسمی تھے، جنھوں نے لکھا:

> ''رام لعل کا انداز تحریر مفکرانہ ہے۔ زندگی کے اس گرجتے دھارے میں اس کی تیز نگاہ ایک بے مایہ تنکے کو بھی دیکھ اور پرکھ سکتی ہے۔ وہ کف آلود لہروں میں گھری ہوئی چٹانوں کی طرف اتنا متوجہ نہیں جتنا بلبلوں، تنکوں اور گردابوں کی طرف۔ وہ نقاش بھی ہے اور عکاس بھی۔ وہ ذہنی تصویریں بھی تیار کر سکتا ہے اور کائنات میں بکھری ہوئی بے شمار تصویروں کا فوٹو بھی اتار سکتا ہے۔ وہ سوچتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے اور یہی خوبی ہے جو اس کی کہانیوں کو زندہ رکھے گی۔ کیونکہ بصیرت اور بصارت اگر الگ الگ ہو کر کام کریں تو زندگی زندگی نہیں رہتی۔''
>
> (''آئینے'' از رام لعل، ایسٹرن آرٹس اکیڈمی، لاہور، 1945)

رام لعل کی افسانہ نگاری کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے ہمیں ان کے افسانوں کے مختلف مدارج کی نشاندہی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ انھوں نے ایک طرف تو بے شمار افسانے لکھے ہیں جن کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی اب تک جتنے افسانے اور سفرنامے وغیرہ دستیاب ہو سکے ہیں ان کے مطابق ان کی تعداد یقینی طور پر 500 سے اوپر ہے۔ دوسری طرف انھوں نے بدلتے ہوئے حالات میں ہر قسم کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی تبدیلیوں کی جا بجا نشاندہی کی ہے۔ رام لعل کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے اوراق لاہور کے ایک شمارے میں نئی نسل کے افسانہ نگار رشید امجد نے کہا تھا کہ رام لعل کے افسانوں کی مدد سے ہندوستان کی پوری ثقافتی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

رام لعل کے اولین افسانوی مجموعہ ''آئینے'' کے افسانوں میں آزادی سے پانچ سات

سال پہلے کے انتشاری دور کی کیفیت ملتی ہے۔ جوان کے اپنے ذہنی انتشار کی بھی غماز ہے۔ وہ اس وقت ایک ایسے نوعمر نوجوان کی ذہنی کیفیات کو پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس کے سامنے کوئی واضح مستقبل نہیں۔ وہ رومان کا بھی متلاشی ہے۔ معقول ملازمت بھی چاہتا ہے۔ اپنے ملکی حالات کے اقتصادی چوکھٹے میں خود کو فٹ بھی نہیں کر پاتا اور ملک چھوڑ کر اور فوج میں بھرتی ہو کر بیرون ملک بھی چلا جانا چاہتا ہے۔ رام لعل نے آزادی کے فوراً بعد اپنے مشاہدات اور تجربات کی مدد سے برصغیر کے طول و عرض میں برپا ہونے والے فسادات کے بارے میں بھی متعدد افسانے لکھے۔ یہ دور بھی نوجوان رام لعل کے ذہنی انتشار کو پیش کرتا ہے جو اب تیس چوبیس برس کی عمر میں پہنچ چکا تھا۔ اس کے سامنے مستقبل اب بھی واضح نہیں تھا۔

فرقہ وارانہ فسادات نے صدیوں کی اخلاقی رواداری کی قدریں تہس نہس کر دی تھیں لیکن ترقی پسند نظریات کے زیر اثر رام لعل نے ان موضوعات پر بھی لکھتے وقت ایک متوازن و صالح نقطۂ نظر اپنایا اور بطور ادیب مظلومین کا ساتھ دیا جس میں فرقہ وارانہ تخصیص نہیں تھی۔ اُس زمانے میں رام لعل کا قیام لکھنؤ میں تھا۔ اس کے آس پاس بے شمار ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کے خاندان اپنی نوآبادکاری کے مسائل سے نبرد آزما تھے۔ رام لعل خود ایک مہاجر تھے۔ وہ ان لوگوں کے مسائل کو بخوبی سمجھتے تھے۔ وہ فسادات کے مابعد اثرات سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہو سکے تھے۔ ان کے سامنے ان اقدار کی شکست و ریخت کا بھی ایک المیہ تھا جو وہ اپنے ساتھ لاہور سے لے کر آئے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے بے خانماں برباد شرنارتھیوں کے بارے میں اور ریلوے کے ماحول کے بارے میں بھی جس سے وہ منسلک تھے کئی فکر انگیز افسانے پیش کیے جنھیں ہم ان کی افسانہ نگاری کی ایک مختلف منزل قرار دے سکتے ہیں۔ پہلے ہم یہ بتانا چاہیں گے کہ جب رام لعل لکھنؤ کی تاریخی و ادبی فضا میں پوری طرح رچ بس گئے تو اس وقت ان سے نسبتاً ذرا کم عمر لیکن ان کے ہم عصر نوجوان افسانہ نگار آغا سہیل ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

> ''کہنے کو بات صرف اتنی ہے کہ رام لعل سے ہماری ملاقات اس وقت ہوئی جبکہ لکھنؤ میں شوکت صدیقی، مجید پرویز، مسیح الحسن اور دوسرے نامور افسانہ نگار اپنے فن کا لوہا منوا کر تقریباً اپنی دکان بڑھا رہے تھے ان میں سے دو تو لکھنؤ سے باہر جا چکے تھے۔ تبھی

رام لعل اچانک نمودار ہوئے اور دیکھتے دیکھتے لکھنؤ کے ادبی منظر پر چھا گئے۔ اس وقت اقبال مجید، قیصر تمکین، رتن سنگھ، سبط اختر، عابد سہیل، احمد جمال پاشا وغیرہ اپنا مقام دھیرے دھیرے بنا رہے تھے۔ یہ کہنا کہ رام لعل مذکور بالا مبتدی افسانہ نگاروں کے برابر کھڑے ہوئے تھے، غلط ہے۔ کیونکہ رام لعل ان سب سے بڑے تھے اور پنجاب کے دوران قیام میں بھی اپنے فن کا لوہا منوا چکے تھے۔ اردو افسانے کا قاری ان سے برابر واقف تھا۔ تو وہ پہلی اور دوسری پیڑھی کے افسانہ نگاروں اور ان کے فن سے بخوبی آگاہ تھے اور بعض افسانہ نگاروں کو اپنا پیش رو تسلیم کرتے تھے۔ اس وقت کے رام لعل کے سر پر بال بھی تھے اور سیاہ بھی تھے جو گورے چٹے رنگ پر بھلے معلوم ہوتے تھے۔ میانہ قد اور سبک خدوخال کے گورے جسم کی شخصیت کے وقار میں ایک خارجی شے ایسی بھی تھی جس سے ان کی دانشوری جھلکتی تھی اور وہ تھی ان کی عینک۔ رام لعل میانوالی کے قدرے کھردرے لہجے میں لکھنوی فضا میں جب اردو بولتے تھے تو لوگوں کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہم جیسے منہ زور مبتدی لڑکے جب بھی ان کی زبان کا نوٹس لیتے تو سرور صاحب، احتشام صاحب فوراً فہمائش کرتے۔ گویا سرور صاحب، احتشام صاحب، حیات اللہ انصاری، نیاز فتح پوری، علی عباس حسینی، مولانا اختر علی تلہری، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، مسعود حسن رضوی ادیب اور اثر لکھنوی وغیرہ بزرگوں کے ہاتھوں میں ہماری لگامیں تھیں ورنہ ہماری منہ زوری کب کسی کو خاطر میں لاتی تھی۔ ہم تو یاوش بخیر، ظفر حسین خاں، سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر وغیرہ کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اور برخود غلط ادیبوں اور شاعروں کو تو چٹکیوں میں اڑا دیتے تھے۔ لیکن رام لعل ایک ایسی شخصیت کے روپ میں سامنے آئے کہ جو سنجیدہ، فہمیدہ، ثقہ اور متین

بھی تھے اور ہم جیسے منہ زور لونڈوں میں مخلی بالطبع ہونا جانتے تھے۔
رام لعل کی آنکھوں کی چمک جو چشمے کے شیشوں میں سے بھی نہیں چھپتی
تھی، صاف صاف چغلی کھاتی تھی کہ وہ ہمیں خوب سمجھتے ہیں۔ اصل
میں قصہ یہ تھا کہ ہم میں سے بعض کو بعض بزرگوں نے شہ دے رکھی
تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم اپنے آپ میں نہیں تھے کیونکہ لکھنؤ کے تمام
قابل ذکر صف اول کے ادیبوں اور شاعروں میں ہمارا اٹھنا بیٹھنا تھا
اور ان سے تبادلۂ خیالات کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ شاید اسی لیے ہم
حواس باختہ تھے۔ رام لعل اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے لیکن منہ سے کچھ
نہ کہتے تھے۔ کہتے تو کیا کہتے اور سوال یہ ہے کہ کس سے کہتے! اس
وقت لکھنؤ کی فضا میں رام لعل بہت ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔
جیسے کسی کو بے یار و مددگار دریا کے تیز دھارے کے رخ
پر چھوڑ دیا جائے اور اسے پیرنا بھی نہ آتا ہو۔''

(مضمون ''کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا'' از آغا سہیل، مشمولہ ''رام لعل شخصیت
اور بساط فکر و فن'' مرتبہ خان فہیم، بریلی، 1994، صفحہ 79 تا 85)

رام لعل کے ریلوے کے ماحول اور شرنارتھیوں کی نو آبادکاری کے مسائل کے بارے میں لکھے ہوئے افسانوں کا اعتراف پروفیسر آل احمد سرور، سید احتشام حسین، خواجہ احمد عباس اور ڈاکٹر محمد حسن نے اسی زمانے میں اپنے مضامین میں وقتاً فوقتاً کیا۔ یوں تو انھوں نے ریلوے کے ماحول کے بارے میں متعدد کہانیاں لکھیں جو اردو ادب میں کیا کسی بھی زبان کے افسانوی ادب میں اتنی کثرت سے لکھنے کی وجہ سے پہلی بار مل جاتی ہیں لیکن ان کی کہانی او۔ سی کو ایک عالمی شہرت حاصل ہوئی جس کا ترجمہ ہندوستان کے علاوہ دنیا کی کئی زبانوں میں کیا گیا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اسی کہانی کو لکھنے کی وجہ سے (علاوہ اس کے 'ایک شہری پاکستان کا') 1958 میں ''سوغات'' بنگلور میں لکھے اپنے مضمون میں رام لعل کو اس کے ہمعصروں میں سرفہرست رکھا تھا۔ وہ ماہنامہ ''کتاب'' لکھنؤ بابت ماہ جون 1965 میں اس دور کی کہانیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرا یہ خیال ہے کہ پچھلے نو دس برس میں بیدی کی اپنے
دکھ مجھے دے دو، رام لعل کی 'اوسی' غازی صلاح الدین کی 'سوسن'
ضمیر الدین احمد کی کہانی، مسیح الحسن کی کہانی، رتن سنگھ، انتظار حسین،
اشفاق احمد، کرشن چندر، غلام عباس اور ممتاز مفتی کی کہانیاں اور نفس
مضمون دونوں حیثیتوں سے نہایت اہم ہیں۔''
(اقتباس از مضمون ڈاکٹر محمد حسن، مطبوعہ، ماہنامہ ''کتاب'' لکھنؤ:
باب جون 1965)

خواجہ احمد عباس نے رفیوجی خاندانوں کے مسائل کے بارے میں لکھی ہوئی کہانی 'ایک شہری پاکستان کا' (جو سب سے پہلے 1958 میں ماہنامہ 'شاعر' بمبئی میں چھپی تھی اور اسے ماہنامہ 'شاہکار' الہ آباد نے بھی انتخاب کیا تھا) کے بارے میں اس کے مدیر محمود احمد ہنر کو لکھا تھا کہ گزشتہ دس سال میں اتنی بڑی کہانی نہیں لکھی گئی ہے۔ خود خواجہ احمد عباس نے ہفت روزہ اردو ''بلٹز'' بمبئی بابت 23/جولائی 1983 میں اس کہانی کے بارے میں لکھا:

''ایک شہری پاکستان کا'' رام لعل کی پہلی کہانی تھی جو میں
نے پڑھی تھی اور اسی وقت سے اس افسانہ نگار کا 'فین' بن گیا۔ کہانی
کیا تھی، اچھا خاصہ نامۂ محبت تھا جو افسانہ نگار نے پاکستان کو بھیجا تھا۔
ایک ہندو پاکستان میں رہ جاتا ہے کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کی
بیوی جس سے اسے محبت تھی فسادات میں ماری گئی تھی۔ اسے دو ہی
چیزوں سے محبت تھی۔ ایک اپنی بیوی سے اور ایک اپنے وطن یعنی
پاکستان سے۔ لہٰذا اس نے پاکستان ہی میں رہنا منظور کر لیا۔ چند
سال کے بعد کسی دوست نے اسے اطلاع دی کہ اس کی بیوی زندہ
ہے اور دہلی میں رہتی ہے مگر اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس لیے کہ وہ
اسے فسادات کا شکار سمجھ بیٹھا تھا۔ سو محبت کا مارا بے چارہ ایک شہری
پاکستان سے ویزا لے کر ہندوستان آتا ہے۔ بیوی کو صرف دور سے
دیکھتا ہے۔ اس کے بچوں کو بھی دیکھتا ہے۔ پھر وہ پاکستان واپس

جانے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد پولیس آتی ہے اور
پوچھتی ہے کہ ایک شہری پاکستان کا وہاں آیا تھا؟''
(خواجہ احمد عباس، اردو ہفت روزہ ''بلٹز'' بمبئی بابت 23 جولائی
1983)

اگر ہم 63-1962 میں رام لعل کے لکھے ہوئے افسانوں پر گہری نظر ڈالیں تو ہمیں ان کے جو افسانے زندگی کے حسین و قابل قدر مرقعے نظر آتے ہیں۔ ان میں مذکور بالا افسانوں کے علاوہ 'نئی دھرتی پرانے گیت' قبر، ریکارڈ کیپر، اماں وغیرہ کا بھی ذکر کرنا ضروری ہوگا، جو اس دور کے بہت اچھے افسانوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ بلکہ ان کی چمک دمک اور اثر انگیزی میں آج بھی فرق نہیں آیا۔ اردو کے ممتاز نقاد سید احتشام حسین جو رام لعل کی لکھنے کی رفتار اور طرز فکر پر گہری نظر رکھتے تھے ان کے مجموعہ ''گلی گلی'' مطبوعہ 1966 کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اردو افسانہ نگاری کی دنیا میں رام لعل نے اپنی جگہ
مسلسل محنت، ریاضت اور طالب علمانہ لگن سے بنائی ہے۔ انھوں
نے اپنی کہانی کی فطری صلاحیت کو مطالعہ، مشاہدہ اور غور و فکر سے
آگے بڑھایا ہے اس کے اثرات ان کے موضوع اور فن دونوں پر
دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے پہلے مجموعے ''آئینے'' سے اس نئے مجموعے
''گلی گلی'' تک انھوں نے ایک طویل سفر کیا ہے لیکن ابھی ان کی
منزل دور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ادیب کا سفر بھی ختم نہیں ہوتا
خوب سے خوب تر کی جستجو جاری رہے تو منزل آگے بڑھتی جاتی ہے۔
مجھے یقین ہے کہ رام لعل جیسی جد و جہد کر رہے ہیں اس کا نتیجہ جلد
نکلے گا اور ان کے افسانوں میں وہ ادبیت پیدا ہوگی جس سے ان کی
ہر دلعزیزی ہی میں نہیں، اہمیت میں بھی اضافہ ہوگا۔''
(سید احتشام حسین، بحوالہ ''رام لعل شخصیت اور بساط فکر و فن''، مرتبہ
خان فہیم، بریلی، 1994)

اسی طرح ایک اور بزرگ نقاد جن کے زیر سایہ رام لعل نے اپنی افسانہ نگاری کی کئی

منزلیں طے کیں اور خصوصی طور سے لکھنؤ کی مجلس ترقی پسند کے اراکین کی سخت تنقیدوں کا سامنا کیا اور یوں تنقید کی بھٹی میں سے تپ کر کندن کی طرح نکلے۔ وہ پروفیسر آل احمد سرور تھے۔ پروفیسر سرور ان کے افسانوی مجموعہ (مطبوعہ 1958) ''نئی دھرتی پرانے گیت'' کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''رام لعل اردو کے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کی نظر صحت اور فن کی پختگی اب اردو دنیا میں تسلیم کی جا چکی ہے۔ میں نے ان کے افسانے سنے بھی ہیں اور پڑھے بھی۔ ان افسانوں میں حقیقت نگاری کے ساتھ حسن اور فن کے التزام کے ساتھ فکر کی گہرائی ہے۔ انھوں نے زیادہ تر انہی موضوعات کو لیا ہے جن سے وہ اچھی طرح واقف ہیں۔ اس واقفیت کی وجہ سے ان کے افسانوں میں جان ہے۔ رام لعل کے افسانے دل میں خاموش خلش پیدا کرتے ہیں۔ ان میں آج کے مظلوم انسانوں کی مظلومیت اور انسانیت سے محبت، دونوں کا عکس ملتا ہے۔ شروع میں مواد ان پر سوار تھا۔ اب وہ مواد کی ترتیب اور تہذیب پر قابو پا گئے ہیں اور اپنے افسانوں کے ذریعے سے جدید اردو ادب کی آرائش وزیبائش میں مصروف ہیں۔''
> (مضمون پروفیسر آل احمد سرور از افسانوی مجموعہ ''نئی دھرتی پرانے گیت'' مصنفہ رام لعل مطبوعہ 1958، بحوالہ رام لعل شخصیت اور بساط فکر وفن، مرتبہ خان فہیم، صفحہ 331، بریلی، 1994)

1960 کے آس پاس کا زمانہ رام لعل کے لیے تخلیق فن کے اعتبار سے بہت ہی کار آمد اور یادگار تھا۔ ان دنوں وہ بہت تیزی سے لکھ رہے تھے۔ ان کے پاس تجربات اور مشاہدات کی بیش بہا دولت تھی۔ مطالعے کے بے پناہ شوق اور نئے سے نئے تر کی تلاش وجستجو کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں تخلیقی جودت بدرجۂ اتم موجود تھی، جس نے انھیں پرانی افسانہ نگاری کے سنگم پر لا کھڑا کیا۔ اس سنگم پر ان کے افکار وعقائد اور فن پر بھی تنقیدی نظر ڈالنے والے نئے نئے نقاد بھی ملتے چلے گئے۔ یہاں ہم ڈاکٹر وزیر آغا، قیصر تمکین، مہدی جعفر اور ڈاکٹر خورشید سمیع وغیرہ کے

تاثرات کو ذرا تفصیل سے پیش کرنا چاہتے ہیں:

''نئی دھرتی پرانے گیت'' مجموعہ نہ صرف یہ کہ رام لعل کی بہترین کہانیاں ہیں بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی ایک لمحۂ فکر مہیا کرتی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ افسانہ مشکل حالات سے دوچار ہے۔ اس مجموعہ کی ہر ایک کہانی میں ایک نیا مسئلہ موجود ہے اور ان میں ایک اعلیٰ تصور اور فن کارانہ مہارت بھی، جس میں درد و کرب کا ایک شدید احساس ملتا ہے۔ خاص طور پر وہ کہانیاں کامیاب ہیں جن میں ہجرت کرنے والوں کے مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ''ایک شہری پاکستان کا'' محض ایک افسانہ نہیں ہے نہ ہی محبت زدہ لوگوں کی افسردگی کی داستان ہے۔ بلکہ اس میں ملک کی تقسیم کے بعد کے اثرات کی تصویر کشی کی گئی ہے، وہ تقسیم جس نے نہ صرف ملک کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا بلکہ اس نے عام طور پر ایک تباہی بھی مچادی۔ قاری کو احساس ہوتا ہے کہ محض تقسیم سے یہ المناکی ظہور پزیر نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ اس سے وابستہ لاکھوں خاندانوں کی زندگیاں اور ان کی معصوم خوشیاں اس کی بھینٹ نہ چڑھ گئی ہوتیں۔''

مندرجہ بالا اقتباس لکھنؤ سے شائع ہونے والے ایک مشہور انگریزی اخبار پائنیر میں شائع شدہ ایک مضمون سے اخذ و ترجمہ ہے، جو اس موقر اخبار کی 17 فروری 1960 کی اشاعت میں شامل تھا۔ اب ایک دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ ہو:

''علاقائیت کو آفاقیت میں بدلنے کا رجحان رام لعل کی پہچان بنتی نظر آتی ہے۔ ایک اچھی مثال ان کا افسانہ ''ایک شہری پاکستان کا'' ہے۔ رام لعل کے اکثر افسانے ناسٹلجیا کی شدت سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہیں واضح کر چکا ہوں کہ ان کی تخلیق میں طبعی مقناطیسیت کو اہمیت حاصل ہے۔ ناسٹلجیا بھی ان کے یہاں (Polarised) ہے۔ اس افسانے میں قطبی لہریں (یہاں پر

مراد مشرقی اور مغربی قطب نہیں ہیں) ہر احساس کو اپنے دوہرے زمینی علاقوں سے جوڑتی بھی ہیں۔ احساسات کا اس طرح بلند ہونا مشرقیت کی پہچان ہے، علاقائیت کی نہیں۔ اس طرح رام لعل جو مسائل سامنے لاتے ہیں، وہ مشرقی مسائل ہیں نہ کہ علاقائی یا مغربی۔ مغربی اس لیے نہیں کہ وہ حسیت پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور ان کے افسانوں کا مرکز مادیت نہیں ہے۔ چنانچہ رام لعل کے افسانوں سے مشرقی نفسیات کی آگہی ہوتی ہے جو یہاں کے کلچر میں پیوست ہے۔"

(مہدی جعفر، "اردو افسانے کے نئے افق" صفحات 23 تا 25)

یہ اقتباس اردو افسانے کے ایک نوجوان نقاد کا اظہار خیال ہے، جس میں انھوں نے رام لعل کے افسانوی ادب کے امتیازات کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے ملک کی تہذیب وتمدن سے اس کے گہرے رشتے اور ان کی مشرقی نفسیات کی آگہی کا ذکر کیا ہے۔

"رام لعل نے نسبتاً زیادہ لکھا ہے۔ چاپ، تنہا خدا، ایک حیرت زدہ لڑکا، اکھڑے ہوئے لوگ وغیرہ۔ یہ سب کہانیاں واقعی قابل التفات ہیں۔ مگر رام لعل کا مسئلہ یہ ہے کہ رام لعل نے بے شمار کردار تخلیق کیے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے کسی بھی کردار پر بھرپور توجہ نہیں دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے تخلیق کردہ کردار اکثر اوقات واقعات کی رو میں بہہ گئے جن میں انھیں ابھرنا تھا۔ اصل بات تو یہ ہوئی کہ واقعہ خود کردار بن گیا اور کردار ایک ضمنی اور اضافی حیثیت کا ہو کر رہ گیا۔ لیکن اس کے باوجود "اکھڑے ہوئے لوگ" ان کی کامیاب کہانی ہے اور نئی افسانہ نگاری میں ایسی مثالیں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔"

("نئی کہانیاں: ایک بازدید" از مسعود منور، ماہنامہ "شاعر" بمبئی شمارہ نمبر 5، 1987)

رام لعل کی کردار نگاری کے بارے میں مسعود منور کا یہ بیان بادی النظر میں ایک معترض کا ہلکا سا اعتراض معلوم ہوتا ہے لیکن واقعے کے بذات خود کردار بن جانے والی بات کہہ کر وہ رام لعل کے افسانوی فن کی ایک اور جہت کی طرف متوجہ کرنے میں خاصے کامیاب نظر آتے ہیں۔ مسعود منور کے اس مضمون کی اشاعت کے تقریباً پانچ سال بعد لاہور کے ماہنامہ ''تخلیق'' میں ان کا ایک اور مضمون شائع ہوا جس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''جناب رام لعل کی ادبی زندگی دو چار برس کی بات نہیں بلکہ رُبع صدی سے کچھ زائد کا قصہ ہے اور ممکن ہے کہ میرے اندازے کے برعکس یہ سلسلہ نصف صدی پر محیط ہو۔ بیتے برسوں میں میں نے انھیں تقریباً تمام معروف اور غیر معروف جرائد و رسائل میں بڑی آن بان سے شائع ہوتے دیکھا ہے اور حسب توفیق پڑھنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن اپنی بچکانہ افتادِ طبع کی بنا پر مجھے ان کے ہاں کوئی ایسا 'لولی پوپ' نہیں ملا جسے میں بہت دیر تک اپنے ذائقوں میں رچا سکتا۔ مثلاً کوئی بابو گوپی ناتھ، کوئی ٹوبہ ٹیک سنگھ، کوئی لحاف، کوئی گڈریا، کوئی پرمیشر سنگھ، کوئی جگا، کوئی آپا یا کوئی جوگیا جیسی کہانی جس کے کرداروں کو میں یاد رکھ سکتا تھا۔ کہانیوں میں کردار نگاری کہانی کا ساٹھ فیصد ہوتی ہے۔ بابو گوپی ناتھ یا سوگندی یاد رہ جاتے ہیں۔ کبھی آپ منگو کوچوان کا سراپا ذہن میں لانے کی کوشش کرتے ہیں کبھی آپ دوستووسکی کے ''ایڈیٹ'' کے مشکین سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ بالکل ویسا ہی کوئی کردار۔ کوئی میجر کردار میں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ٹائپ کرداروں کی یہی تو مصیبت ہے کہ وہ یاد نہیں رہتے۔''

(مسعود منور از ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور، دسمبر 1992)

رام لعل کے افسانوں کے کرداروں پر بحث کرنے سے پہلے ہم چاہیں گے کہ رام لعل کے یہاں کردار نگاری کا جو رجحان ملتا ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے کو بھی ملحوظ

رکھا جائے جو برصغیر کے ایک اہم اور نہایت متوازن نقاد ہیں اور جنھوں نے شاعری کے علاوہ اردو افسانے پر بھی کئی اچھے اور اعلیٰ معیاری تنقیدی مضامین لکھے ہیں:

> ''تقسیم ملک نے معاشرے میں لاتعداد کردار اُبھار دیے اور افسانہ نگار کی نظریں ان پر مرکوز ہونے لگیں جس کے نتیجے میں کردار نگاری کی ایک بھرپور روش وجود میں آ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے ارضی پہلوؤں کو قریب سے دیکھنے کا رجحان بھی عام ہو گیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس دَور کا افسانہ نگار چھت سے اتر کر کمرے میں آ گیا اور وہاں اجسام کی قربت سے بڑی طرح متاثر ہوا۔ اس ارضی رجحان کے تحت رحمٰن مذنب، جیلانی بانو، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، مہیندر ناتھ، ستیش بترا، صادق حسین، قرۃ العین حیدر، بلراج کومل، یونس جاوید (یہ فہرست قطعاً نامکمل ہے) کے نام خاص طور پر اہم ہیں۔ ان میں سے بعض افسانہ نگاروں نے تو اردو افسانہ کے دوسرے دور ہی میں نام پیدا کر لیا تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد بھی ان کی تخلیق کی رفتار مدھم نہیں ہوئی اور انھوں نے کردار نگاری کے رجحان کو زندہ رکھا۔ کردار نگاری کے سلسلے میں اس نئے دور کے افسانہ نگاروں میں میرزا ادیب، رام لعل اور رحمٰن مذنب کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ..... رام لعل نے صرف وسیع تر زندگی سے اپنے کردار منتخب کیے بلکہ کردار کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہوئے بھی خود کو محض چند پہلوؤں تک محدود نہیں رکھا۔ رام لعل نے اپنے افسانوں میں واقعات کا اہتمام اس طور پر کیا ہے کہ ہر کردار کا اہم ترین شخصی پہلو ابھر کر قاری کے سامنے آ گیا ہے۔ یوں رام لعل متعدد کرداروں کے ایک ہی پہلو کی نقاب کشائی کرتا نظر نہیں آتا بلکہ ہر کردار کو پرکھتا اور اس کی ممتاز ترین جہت کو نمایاں کر کے پیش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔''

(''اردو افسانے کے تین دور'' از وزیر آغا، ''اردو افسانہ: روایت اور
مسائل'' مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، دہلی، 1981)

یوں تو رام لعل کے متعدد افسانوں میں ناقابل فراموش کردار مل جاتے ہیں مثلاً ان کے افسانہ ''سیوادار'' کا سردار لکھن سنگھ جو بیک وقت ہمدرد اور خود غرض بھی ہے۔ ''ایک شہری پاکستان کا'' میں سرسوتی جیسی مشرقی روایات کی اسیر جو پہلے شوہر کی گمشدگی کے بعد ایک دوسرے مرد کی قانونی تحویل میں آجاتی ہے اور پھر جب اس کا پہلا شوہر کئی برس کے بعد اچانک اس کے سامنے پہنچ جاتا ہے تو اس کی تمام تر نفسیاتی ذہنی کشمکش ایک اعلیٰ کردار کو جنم دے دیتی ہے۔ ان کے افسانے ''چاپ'' کا کردار وِکاس جو اپنے ہمزاد کی نشاندہی کے طفیل اپنے گھر میں چھپے ہوئے دفینے تک پہنچنے کی جان لیوا جدوجہد کرتا ہے، اردو ادب کا ایک لافانی کردار بن گیا ہے۔ اس شخص کی نفسیات انسانی معاشرے کی زرطلبی، انتہائی جذباتی رشتوں سے گریز اور پیکار کی بڑی خوب صورت تصویر کشی کرتی ہے۔

ان کے افسانے ''قبر'' کی بلقیس جو زندگی بھر اس لیے اپنے شوہر کے ساتھ ذہنی مفاہمت نہ کر پائی کہ وہ اس کی خواہش کے مطابق ہندوستان چھوڑ کر پاکستان نہیں گیا۔ لیکن بلقیس ان حالات میں بھی اپنے آبائی وطن اقبال پور میں وقتاً فوقتاً جانا نہیں بھولتی جہاں اس کے والدین اور نانا و نانی و دیگر بزرگوں کی قبریں ہیں اب پھر جب اس پر یہ منکشف ہوتا ہے اس کے شوہر کے بچپن کی یادوں میں بھی ایک قبر سے گہری جذباتی وابستگی موجود ہے۔ تو اس کے دل میں اپنے شوہر کے لیے پہلی بار تائید اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اس طرح فسادات کا وہ واقعاتی اظہار جو شروع میں اس افسانے میں اُبھارا گیا ہے۔ اچانک میاں بیوی کے درمیان ذہنی نااتفاقی کا ایک علامتی فساد ثابت ہو کر آناً فاناً ختم بھی ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں خالد سے کہیں زیادہ اس کی بیوی بلقیس کے کردار میں جان اور کشمکش ہے۔

اسی طرح ''اکھڑے ہوئے لوگ'' افسانے میں مسز بسیں کا کردار جو اپنے داماد اور بیٹی کے باہمی اختلافات کو ختم کرانے کے لیے ان کے پاس جاتی ہے وہ اتنا حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ اپنی بیٹی کے مقابلے میں داماد کی حمایت کرنا ضروری سمجھتی ہے۔ جو ایک غیر ذمے دار شخص ہے اور اپنی بیوی سے چھپ چھپ کر ایک دوسری عورت سے بھی جا کر ملتا

رہتا ہے۔ اسی طرح ''ہیڈلیس بدھا'' کا آرٹ کا نقاد گنگولی اور ''اماں'' افسانے کی بڑھیا قابل ذکر کردار ہیں۔ لیکن رام لعل کی افسانہ نگاری کا آغاز پلاٹ سے انحراف کے طور پر ہوا تھا۔ اور درمیانی دور میں بقول آل احمد سرور ''پہلے ان پر مواد سوار تھا'' کردار، واقعات اور موضوع کے بارے میں وہ مسلسل تجربات کرتے رہے۔ مثال کے طور پر ان کے افسانے ''تماشا'' میں رام ملن پانڈے ایک نمائندہ کردار بن کر نہیں ابھرتا جو کسی اندرونی اذیت سے نجات پانے کے لیے چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جاتی ہوئی جھانسی میل کے کسی ایک ڈبے میں اچانک اچھل کر سوار ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس افسانے میں تماشائیوں کا اجتماع ہی ایک مجموعی کردار بن کر سامنے آتا ہے، تفریح کا دلدادہ اور اذیت پسند واقع ہوا ہے۔ اسی طرح افسانہ ''بھیڑ'' میں کوئی ایک کردار نمائندہ نہیں بن پاتا۔ بلکہ وہاں بھی لوگوں کی بھیڑ ایک مجموعی کردار بن جاتی ہے۔ جوگیندر پال ان کے افسانوں میں سے ''ایک حیرت زدہ لڑکا'' کے ایک نادار، آوارہ اور یتیم لڑکے کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''ہمارا نظام پہلے تو ان کے مفلس والدین کو قتل کرتا ہے۔ پھر اس پر اصرار کرتا ہے کہ وہ استمراری افلاس میں پورے نظم وضبط کے ساتھ بڑے بھی ہوں''۔ بقول محمد علی صدیقی:

> ''رام لعل بلاشبہ اردو کا جدید ترقی پسند افسانہ نگار ہے۔ وہ فارم کی فضیلت کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی بعض جدیدیت پسند دیتے ہیں۔ اس کے نزدیک موضوع ہی مقدم ومقدس ہے۔ کیونکہ اس کا یقین ہے کہ موضوع اپنے لیے فارم کا مسئلہ خود حل کر لیتا ہے۔ وہ فارم اور موضوع کے باہمی پیکار وان کے تقاضوں سے نپٹنا خوب جانتا ہے۔ اس لیے اس کی نثر سادہ وپُرکار، رواں دواں اور فکر انگیز ہوتی ہے۔ اس کے یہاں عام انسانی تعلقات تک کو بڑی باریک بینی سے دیکھنے کا رجحان ملتا ہے۔ اس احساس کے ساتھ کہ پیش کیے ہوئے کرداروں کے دل میں جتنا گہرا اُترا جائے گا اور بھی کچھ دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ملے گا۔''
>
> (محمد علی صدیقی، انگریزی روزنامہ ''ڈان'' کراچی سے ترجمہ)

رام لعل کی کہانیوں کے بارے میں ان کے ایک اور ہمعصر نئی نسل کے افسانہ نگار انور

خان لکھتے ہیں:

''ان کی (رام لعل) کی کہانیوں میں ہر طرح کے کردار ہیں۔ کلرک، افسر، پولیس آفیسر، ایجنٹ، معلم، بزنس مین، کالج کے لڑکے لڑکیاں، گھریلو اور ملازمت پیشہ عورتیں۔ اپنی کہانیوں میں وہ کرداروں کو غیر معمولی بنا کر پیش نہیں کرتے۔ ذہین سے ذہین اور حساس شخصیت کو وہ ایک مانوس سیٹ اَپ میں مسائل سے نبرد آزما دکھاتے ہیں۔ والدین جنھوں نے بڑی امنگوں سے بچوں کو پروان چڑھایا ہے۔ کامیابی کی منزلوں پر گامزن کیا ہے، اس وقت صدمے سے دوچار ہوتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ کامیابی کا ایسا کچھ خواہاں نہیں بلکہ اسی وجہ سے وہ ان سے ناخوش ہے! وہ اپنی زندگی خود گزارنا چاہتا ہے۔ معاشرے میں کامیابی کی اسے کوئی پرواہ نہیں۔ وہ اپنی معمولی زندگی میں بھی خوش ہے۔ کبھی وہ دوسری ذات یا مذہب کی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ کبھی شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی کسی اور عورت سے اس کے تعلقات ہوتے ہیں۔ کبھی شادی شدہ جوڑے معمول کی سطح پر ایک دوسرے کو قبول نہیں کر پاتے۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنی علاحدہ زندگیوں اور دلچسپیوں پر اصرار کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے افسانوں کا دائرہ کار منٹو، بیدی، کرشن چند اور دوسرے تمام افسانہ نگاروں سے مختلف ہے۔ وہ نہ تو کرداروں کی نفسیات میں غوطہ زن ہوتے ہیں نہ انھیں اساطیر سے دلچسپی ہے۔ نہ انھیں خاکہ نگاری سے لگاؤ ہے اور نہ ہی وہ اخلاقیات کی خوراکیں پلاتے ہیں۔ ان کے کردار معاشرے سے توافق نہیں کر پاتے مگر اب نارمل بھی نہیں، ذہین اور حساس اشخاص ہیں اور یہی ذہانت اور روشن نظری ان کا برزخ ہے۔ دن بدن بڑھتا کرپشن، مذہب کی تیزی سے کمزور ہوتی گرفت، تیزی سے بدلتی قدریں،

روایت سے انحراف، بزرگوں اور نوجوانوں کے درمیان ترسیل کا فقدان ایسے موضوعات ہیں جو رام لعل کی کہانیوں میں بار بار آتے ہیں۔ اس مجموعے میں سولہ افسانے ہیں۔ پڑوسنیں، دلِ خود کفیل، پیاسے ہونٹوں کا دریا، دوستی کے لیے شرط، شادی شدہ اور ادھیڑ عمر لوگوں کے آپسی تعلقات، ان کی الجھنوں اور غلط فہمیوں پر ہیں۔ ''دلِ خود کفیل'' کی سیما شوری شادی کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ بیوہ ہو جاتی ہے۔ کئی سال بعد اس کا دوست اویناش اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے درخواست کرتا ہے مگر وہ یہ سوچ کر کہ اس وقت اس کے بوڑھے سسر کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ انکار کر دیتی ہے۔ ایک نازک موضوع کو رام لعل نے بہت احتیاط سے چھوا ہے۔ ان کا غیر جذباتی انداز اور نپا تلا بیانیہ کہانی کے تاثر میں اضافہ کرتا ہے۔

''دوستی کے لیے شرط'' کی انیتا بھاردواج ہمارے سماج میں تعلیم یافتہ عورت کا ایک نیا روپ ہے۔ ایک نان گزیٹیڈ افسر، محفلوں میں امتیازی حیثیت کی مالک اور اس بات کی قائل کہ عورت کو اپنے بل بوتے پر جینا چاہیے۔ اسی لیے وہ شادی کی قائل نہیں۔ یہ اس طرح کے کردار ہیں جن کا تصور آزادی سے قبل ممکن نہیں تھا۔ یہ ہمارے نئے سماج کی دین ہے۔ یہ اس طرح کے کردار ہیں، باشعور افراد کی کہانیاں ہیں جو اپنا فیصلہ خود کرتے ہیں، سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ اور ان کے عواقب قبول کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ افسانہ ''چنگل'' میں انھوں نے ایک نوجوان جوڑے کی کہانی بیان کی ہے۔ سریندر جس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے طے کرتا ہے کہ وہ اپنے تمام رشتہ داروں سے ملے گا جو مختلف شہروں، علاقوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ دونوں ہی بڑے دلچسپ واقعات سے دوچار ہوتے ہیں۔ بزرگوں اور نوجوانوں کے درمیان ذہنی خلیج اور کشمکش

رام لعل کا پسندیدہ موضوع ہے۔ مگر ادھر ''اکھڑے ہوئے لوگ'' سدا بہار چاندنی میں ان کی دلچسپی کا محور، ادھیڑ عمر اور معمر افراد کا ان کے ذہنی، جنسی اور دوسرے مسائل ہیں۔ کبھی وہ کسی نوجوان لڑکی کو کسی ادھیڑ عمر کی شاندار شخصیت سے متاثر بتاتے ہیں، کبھی دو عورتیں جن میں ایک ادھیڑ عمر کی ہے ایک نوجوان سے لگاؤ محسوس کرنے لگتی ہے۔ رام لعل اپنے کرداروں کے ساتھ خود جذباتی نہیں ہوتے۔ وہ راوی کا رول ادا کرتے ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتا یا کبھی کبھی آتا ہے اور ہم سے ان واقعات کو اس طرح بیان کرتا ہے۔ جیسے کسی محفل میں، ریل کے سفر میں یا دیوان خانے میں کوئی دلچسپ واقعہ بیان کر رہا ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ کرداروں کی نفسیات میں غوطہ زن نہیں ہوتے نہ ان پر رائے زنی کرتے ہیں۔ یہی ان کی دلچسپی کا راز ہے۔''

(انور خان: ماہنامہ ''کتاب نما''، اپریل 1988)

مذکورہ مباحث سے تین چیزیں واضح طور پر ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

1۔ رام لعل کے افسانوں کے کردار۔

2۔ رام لعل کے افسانوں میں عصری معاشرہ۔

3۔ رام لعل کا طرزِ نگارش۔ بیانیہ۔

رام لعل کے لاتعداد افسانوں میں اگر صرف کرداروں کی ایک فہرست بنا کر ان کی نفسیات پر بحث کی جائے تو ایک دلچسپ کتاب لکھی جا سکتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رام لعل کے افسانوں کے کردار اپنے واقعاتی تناظر میں اس قدر مربوط ہیں کہ کردار واقعات دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

رام لعل کے افسانوں کا معاشرہ دراصل آزادیٔ ہند کے بعد ہمارے سماج میں ابھرنے والے انسان کا المیہ ہے۔ اس کے بارے میں اردو کے جدید نقاد محمود ہاشمی لکھتے ہیں:

''رام لعل کے یہ افسانے موجودہ معاشرے اور موجودہ انسان کے ایسے ہی بھیانک اور کرب انگیز لمحوں کی داستان سمیٹے

ہوئے ہیں۔ یہ لمحے جامد اور ساکت اور بے آواز ہوتے ہوئے بھی
اپنی آواز کی پہچان کے لیے خود اپنے آپ سے نبرد آزما ہیں۔ جینے کا
تمام انداز نباہنے، سنوارنے، بسانے اور بسنے کی تمام امنگوں کے
باوجود یہ تمام کہانیاں یہ پتہ دیتی ہیں کہ ہمارے شہروں میں چلنے
پھرنے والے بے شمار انسان، ان کا شور وغل دراصل ایک سکوت کا
خالق ہے۔ ایسا سکوت جس میں ہماری شخصیت کے تمام اسرار موجود
ہیں اور جو اپنی المناکی کے باوجود ہماری آواز اور ہماری پکارنے کی
صلاحیت کی شہ رگ کو دبائے ہوئے ہے۔''

(''آواز کا المیہ'' محمود ہاشمی، بحوالہ رام لعل شخصیت اور بساط فکر وفن،
مرتبہ خان فہیم، بریلی، 1994، صفحہ 78)

بیانیہ کے بارے میں یہ بات بلا خوف وتردید کہی جاسکتی ہے کہ افسانے کا اصل حُسن اس کے بیانیہ ہی میں مضمر ہے۔ اردو کے زیادہ تر افسانے اسی طرز میں لکھے گئے ہیں۔ بیانیہ کے طرز کو توڑنے کی شعوری کوشش 1960 کے بعد اُبھرنے والے بعض افسانہ نگاروں نے کی تھی۔ جس کا بڑا سبب ان کے نزدیک خود اپنی منفرد شناخت بنانا بھی تھا۔ لیکن رام لعل نے اس سلسلے میں افسانے کے فطری تقاضوں کو زیادہ اہمیت دی اور یہ فیصلہ اپنے کردار و موضوع پر چھوڑ دیا کہ اسے کس انداز سے لکھ کر موثر بنایا جاسکتا ہے۔ یہاں ہم رام لعل کے بارے میں پروفیسر محمد علی صدیقی کی اس رائے کو پھر پیش کریں گے:

''وہ فارم کی فضیلت کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی بعض
جدیدیت پسند دیتے ہیں۔ اس کے نزدیک موضوع ہی مقدم اور
مقدس ہے کیونکہ اس کا یقین ہے کہ موضوع اپنے لیے فارم کا مسئلہ
خود حل کرلیتا ہے وہ فارم اور موضوع کے باہمی پیکار اور ان کے
تقاضوں سے نپٹنا خوب جانتا ہے۔''

(انگریزی روزنامہ ڈان کراچی، پروفیسر محمد علی صدیقی)

ڈاکٹر انور سدید نے رام لعل کے بیانیہ کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:

''بیانیہ اسلوب کو رام لعل نے جس کامیابی سے استعمال کیا ہے یہ کامیابی بیانیہ اسلوب کے دوسرے بیش تر افسانہ نگاروں کو حاصل نہیں ہو سکی۔''

(''1980 کا اردو ادب'' از ڈاکٹر انور سدید، ماہنامہ اوراق، لاہور، 1981)

یوں دیکھا جائے تو بیانیہ کے اسلوب کو توڑ کر محض اپنی شناخت کے لیے نئے نئے فارم وضع کرنا قابل ستائش سہی لیکن اس ضمن میں جو ابہام پیدا ہو گیا اس سے مجموعی طور پر اردو افسانے کو خاصہ نقصان پہنچا ہے جس کے نتیجے میں اردو قاری افسانے سے دور ہوتا چلا گیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ 1980 کے آس پاس کہانی اپنے بنیادی بیانیہ اسلوب کی طرف لوٹ آئی لیکن یہ مسئلہ بھی اپنی جگہ پر قائم رہا کہ گزشتہ نسل کے لوگوں سے نئی نسل کتنی مختلف تھی۔ رام لعل خود اس موضوع پر اپنے مضامین، انٹرویو، تقریروں اور مباحثوں میں تواتر کے ساتھ وقتاً فوقتاً اظہار خیال کرتے رہے ہیں۔ اپنے ایک مضمون بعنوان ''اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا'' میں انھوں نے اس موضوع پر اس طرح رائے زنی کی ہے:

''ایسا لگتا تھا ان کے اور ہمارے گروہوں کے درمیان کچھ قدریں مشترک ہیں۔ کچھ بنیادی سچائیوں کی پاسداری ہم سب کو عزیز ہے انصاف پسندی، کسی گروہ کی بھی کہانیوں سے مکمل طور پر غائب نہیں ہو سکی ہے۔ لیکن یہ انصاف پسندی پریم چند کے آورش واد سے یکسر مختلف تھی۔ پریم چند کے بعد تو ان سارے لکھنے والوں نے اردو کہانی کو ایک نئے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی شعور کی آگہی دے دی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد آنے والوں نے ان خصوصیات کے علاوہ ایک ایسا اینٹی چیوڈ بھی اپنایا ہے جو کافی حد تک انٹی ہیرو ہے اور المناک بھی ہے۔ انسانی رویے کے دو ہی رخ ہوتے ہیں ہم حقائق کا بڑی دلیری سے سامنا کر سکتے ہیں۔ یا ہم ان کا سامنا کرنے میں ناکام رہ جاتے ہیں۔ یہی دو رویے یا تو ہمیں انسانی سطح سے اوپر اٹھا

دیتے ہیں یا اس سطح سے اوپر بالکل نہیں اٹھا پاتے ہیں۔ بیسویں صدی میں اب تک دو ہی طرح کے لوگ رہے ہیں۔۔ انتہائی کامیاب یا ناکام اور حساس۔ پریم چند کے فوراً بعد آنے والوں کے یہاں ہیرو کا تصور جوں کا توں قائم نہیں رہ سکا تھا لیکن وہ تھا پھر بھی ہیرو کا ہی۔ چاہے وہ شکست خوردہ تھا۔ لیکن حقائق سے آنکھیں ملا کر انھیں للکارنے کی اپنے اندر بے پناہ جرأت رکھتا تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سانحۂ جلیانوالہ باغ اور بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی دیے جانے کے بعد بھی ایک بڑی لڑائی کی گھن گرج ہمارے ادب میں واضح طور پر محسوس ہوتی ہے شاید آزادی کے بعد آنے والے ہم افسانہ نگاروں میں نئے انسان کی ٹریجیڈی اور شکست خوردگی کے کچھ نئے پیمانے وضع کر لیے کیونکہ ہمارے آزادی کے ساتھ جڑے ہوئے بیشتر آدرش ٹوٹ گئے تھے۔ نئے آدمی کی ذہانت اور تعلیمی صلاحیتوں کی قدر نہیں کی گئی تھی۔ ہمارے سامنے ہی لوٹ کھسوٹ، کنبہ پروری اور رشوت ستانی وغیرہ کو قانونی تحفظ دینے کی کوشش کی گئی۔ ایسے دور کا لکھنے والا اپنی تخلیقات میں ایک ہیرو کو روایتی معنوں میں کیونکر پیش کر سکتا تھا۔''

(''اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا'': رام لعل، نئی دہلی، 1985، صفحہ 16)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں اگر رام لعل کے افسانوں کا بغائر مطالعہ کیا جائے تو ان کے افسانوں کے جملہ محرکات، فنی خوبیاں، بیانیہ کا استعمال، فارم اور موضوع کا صحیح امتزاج اور التزام سبھی کچھ ہمارے سامنے واضح ہو جاتا ہے اور ان کے افسانوی فن کے انفراد و امتیاز کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے جو ظاہر ہے کہ خاصی دلکش اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز بھی ہے۔

تقسیمِ ہند سے پیدا شدہ حالات
اور
رام لعل کے افسانے

ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی ملک کی تقسیم یوں تو 15 راگست 1947 میں عمل میں آئی لیکن اس کے حصول کے لیے دو قومی نظریے کے حامیوں اور متحدہ ہندوستان کے چاہنے والوں کے درمیان شدید رسہ کشی کا رجحان 1940 کے آس پاس شروع ہو گیا تھا۔ انگریز ہندوستان کی آزادی کی اسپرٹ کو کچلنے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کر رہا تھا۔ 1943 میں بنگال میں جو بہت بڑا قحط پڑا اس کے پیچھے بھی اُسی کا ہاتھ تھا۔ ہندو مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کی خلیج کو گہری اور وسیع کرنے میں اس کی در پردہ حکمت عملی کارفرما تھی۔ ملک کے طول و عرض میں یہاں وہاں کئی شہروں میں فرقہ وارانہ تناؤ پیدا ہو جاتا تھا۔ کہیں کہیں فسادات بھی پھوٹ پڑتے تھے۔ ان تمام حالات کا اثر ہمارے ادیبوں پر بھی پڑ رہا تھا۔ مثال کے طور پر قحطِ بنگال کے بارے میں سب سے بڑی اور سب سے موثر تخلیق ایک طویل افسانے کی صورت میں ''ان داتا'' کے عنوان سے کرشن چندر جیسے قد آور افسانہ نگار کے قلم سے نکلی۔ اس موضوع پر خواجہ احمد عباس، دیوندر ستیارتھی اور کئی ترقی پسندوں نے بھی یادگار افسانے لکھے۔ خواجہ احمد عباس نے اس موضوع پر ایک فلم بھی بنائی۔

اسی طرح ''بھوکا ہے بنگال'' کے عنوان سے واجق جون پوری نے ایک نظم کے ساتھ شعری ادب میں اضافہ کیا۔ سعادت حسن منٹو نے ایک افسانہ ''آپریشن'' کے نام سے پیش کیا جس میں انھوں نے آزادی کے حصول کو ایک بچے کی بذریعہ آپریشن پیدائش کو علامت بنا کر پیش کیا۔ سیاسی تناؤ صرف عوام یا مسلم لیگ اور کانگریس کے رہنماؤں کے ذہنوں میں ہی نہیں تھا بلکہ وہ ادیبوں کے دل و دماغ میں بھی اُبھر رہا تھا۔ مثال کے طور پر ماہ نامہ ''ساقی'' میں اس کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی نے پاکستان کی حمایت میں اداریہ لکھا۔ اس کے بعد محمد حسن عسکری اور احمد ندیم قاسمی نے بھی پاکستان کے قیام کے حق میں مضامین لکھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ انگریز نے ملک کی واقعتاً تقسیم کے بارے میں اپنا عندیہ ظاہر کر دیا تھا اور مسلم لیگ و کانگریس کے ساتھ اس نے سرحدوں کی فوجوں کی قوی خزانے کی اور دیگر املاک کی تقسیم و آبادی کی نقل و حرکت کے جملہ انتظامات کے بارے میں بھی گفت و شنید شروع کر دی تھی۔

ملک کی تقسیم پرامن طریقے سے نہیں ہوئی بلکہ کچھ عرصہ پہلے ہی فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو آزادی ملنے کے ایک عرصے بعد تک چلتا رہا۔ (بلکہ اب تک چلتا آرہا ہے) فسادات میں لاکھوں انسانوں کو مار ڈالا گیا۔ ان کے گھر جلا دیے گئے، عورتوں کی عصمت لوٹی گئی۔ درندگی، وحشت، حیوانیت اور انارکی کے اس ماحول میں دونوں طرف سے لاکھوں آدمیوں نے قافلوں کی صورت نقلِ مکانی کی۔ راستوں میں بھی ان پر کبھی فسادیوں نے حملہ کیا۔ کبھی مختلف وباؤں نے۔ جو سیلاب میں بہہ گئے وہ الگ۔ ایک اندازے کے مطابق اس میں مجموعی طور پر ایک لاکھ سے زیادہ مرد و زن بوڑھے اور بچے لقمۂ اجل بنا دیے گئے۔

ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ ناگفتہ بہ حالات ایک اتنے بڑے المناک حادثے کے مماثل تھے، جس کے بارے میں ہمارے ادیب خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ ان میں سب سے پہلے کرشن چندر نے متعدد افسانے پیش کیے جو ''ہم وحشی ہیں'' کے عنوان سے کتابی صورت میں چھپے۔ ان افسانوں میں فسادات کے پیچھے غیر ملکی قوت کا ہاتھ واضح طور پر دکھایا گیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی صدیوں کی باہمی روایات کو بھی بڑی جذباتیت سے پیش کیا گیا تھا۔ سعادت حسن منٹو نے ''سیاہ حاشیے'' کے عنوان سے چھوٹے چھوٹے افسانچوں میں فسادات میں ملوث قاتلوں یا مقتولین کی نفسیات کی حقیقی اور مؤثر تصویریں پیش کیں۔ فکر تونسوی نے پنجاب کے پانچ دریاؤں

کی تقسیم پر آنسو بہاتے ہوئے ''چھٹا دریا'' کے عنوان سے ایک طویل رپورتاژ لکھا جو دراصل ایک ایسا خون کا دریا تھا جو ہندوستان پاکستان کے درمیان بہہ رہا تھا۔ شاہد احمد دہلوی نے ''دلی کی بپتا'' کے عنوان سے ایک رپورتاژ لکھا جس کا تعلق ہندوستان کی آزادی کے بعد برپا ہونے والے دلی کے فسادات سے تھا۔ پنجابی کی مشہور شاعرہ امرتا پریتم نے 'اج انکھاں وارث شاہ نو' کے عنوان سے منظوم المیہ لکھا۔ الغرض اردو اور پنجابی کے علاوہ اور بھی کئی زبانوں کے باضمیر اور حساس ادیب اپنے خیالات کا تخلیقی اظہار کر رہے تھے۔ ایسے میں نئی نسل کے ادیب رام لعل بھی ناگفتہ بہ حالات سے گزر رہے تھے اور افسانے بھی لکھ رہے تھے۔ لیکن رام لعل کے افسانوں کا تعلق فسادات سے کم اور جڑوں سے اکھڑے ہوئے شرنارتھیوں اور مہاجروں کی نو آبادکاری کے مسائل سے زیادہ تھا۔ مثال کے طور پر رام لعل کے متعدد افسانے ''نئی دھرتی پرانے گیت''، ''ایک شہری پاکستان کا''، ''نصیب جلی''، انقلاب آنے تک''، ''ایک عورت تھی علاجِ غمِ دنیا تو نہ تھی''، ''بھیڑیے''، ''کھیتوں کی رانی''، ''شگن'' وغیرہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔ بقول نسیم کنجاہی نئی دھرتی پرانے گیت:

> ''ایک ایسی کہانی ہے جو کچھ ایسے پنجابی خاندانوں کے گرد گھومتی ہے جو اپنے وطن عزیز سے ہزاروں میل دور لکھنؤ میں زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ زندگی جو بے شمار صعوبتوں سے بھری ہوئی ہے، زندگی جس کی تلخیوں نے انھیں ایک دوسرے سے بدزن اور بدگمان کر دیا ہے۔ اِنہی بدگمانیوں نے دو کنبوں کے درمیان نفرت کی ایک دیوار کھڑی کر دی ہے جو مغربی پنجاب کے کسی شہر غالباً میانوالی کے رہنے والے تھے اور جن کی حیات ماضی کا بیشتر حصہ ایک ساتھ گزرا تھا۔ یہاں بھی شادی ہی کی ایک تقریب بظاہر دونوں کنبوں کو پھر سے قریب لے آتی ہے مگر کہانی کے باطن میں اتر کر دیکھئے تو بڑے حسین انکشافات ہوں گے۔ یہ معجزہ دراصل ان لوک گیتوں کی وجہ سے ظہور میں آتا ہے جو صدیوں سے ان کے سینوں میں محفوظ چلے آ رہے تھے اور جن کو وہ ایک متاع عزیز کی طرح اپنے ساتھ لائے تھے، گیت جنھیں نہ تو چرایا جا سکتا ہے نہ کوئی لٹیرا انھیں

لوٹ ہی سکتا ہے۔ نئی دھرتی پر یہ پرانے گیت ہی پیغامِ صلح اور درسِ محبت بن جاتے ہیں۔ دلوں کی کدورتیں دھل جاتی ہیں اور بچھڑے ہوئے گلے مل جاتے ہیں یہ آرٹ کی بہت بڑی فتح ہے۔ آرٹ جو واقعی زخموں کا مرہم ہے اور جس کی وجہ سے زہر آب حیات کی تلخیاں بھی گوارا ہو جاتی ہیں جو نیش کو نوش میں بدل دینے کی قوت رکھتا ہے۔ کہانی کا یہ بنیادی نقطۂ تخیل جس درجہ حسین و پاکیزہ ہے اس سے بھی کہیں زیادہ حسین و پاکیزہ تر فضا اس کہانی میں اول سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ لوک گیت کے سحرِ تاثر سے سائیں داس کا مضطرب ہو جانا اور ایک جذبۂ بے اختیار کے تحت محفل رقص و سرور میں جا پہنچنا بجائے خود ایک دلکش اقدام ہے جس کی داد خود فراموشیوں ہی سے لی جا سکتی ہے۔ نغمے کے زیر و بم میں ماضی کے پاؤں کی چاپ سن لینا اور حیات رفتہ کے لمحوں کو لوٹتے ہوئے دیکھنا کس درجہ کیف ساماں ہے۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں فطرت نے ماضی کی صدائے بازگشت کے سننے کی اہمیت بھی عطا کی ہے۔ یہ کہانی رام لعل کی بہترین کہانی ہے نفس موضوع کے اعتبار سے بھی اور فنی نزاکتوں اور شعری لطافتوں کے لحاظ سے بھی رام لعل کے فن کی روح اس کہانی میں سرشار نغمہ اور سحرِ دلبری میں ڈوبی ہوئی ملے گی۔ ایک دو مقامات پر تو کہانی غزلِ رقصاں اور شعرِ خنداں بن کر رہ گئی ہے۔ رام لعل نے یہاں فن کی ان بلندیوں کو چھو لیا ہے جن کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے شعر و ادب کی نغمہ ریز وادیوں میں بھی اس کے قدم کہیں ڈگمگائے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ موضوع پر اس کی گرفت محکم تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ سرلا اور ترلوک کے ربط پنہاں کو جس معنی خیز طریقے سے اس نے ظاہر کیا ہے وہ حسین ایمائیت اور بلیغ تر اشاریت کی ایک پاکیزہ مثال ہے۔ رام لعل اس کہانی میں پہلی بار

شاعرانہ اسلوب فکر اور ادیبانہ طرز بیان کی روایت قائم کرتا ہے۔ خدا کرے مستقبل اس میں اور بھی رنگین افسانوں کا باعث ہو یہ سچ ہے کہ ایک اچھے کہانی کار کی طرح اس نے یہاں بھی سادگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اہتمامِ انشا پردازی اور شکوہِ الفاظ سے کام لینا اسے کبھی پسند نہ آتا۔ پھر بھی اس کہانی کے بعض فقرے ان قطراتِ شبنم کی یاد دلاتے ہیں جو برگہائے گل پر لڑھک رہے ہوں اس طرح کہ آفتاب کی شعاعیں بھی ان میں نفوذ کر رہی ہوں۔ رام لعل کے اس شہ پارۂ ادب میں جو زندگی کی عظیم حقیقت بھی ہے الفاظ میں تعریف کسی طرح ممکن نہیں خصوصاً دیوار کے عبور کرنے کا سین تو بہت ہی خوب صورت اور ترقی پسندانہ ہے۔''

(اقتباس از نسیم کنجاہی، پیش لفظ، ''نئی دھرتی پرانے گیت'' مصنفہ رام لعل، صفحہ 22 تا 23 مطبوعہ 1958)

''ایک شہری پاکستان کا'' تقسیم وطن سے جنم لینے والی ایک ٹریجڈی ہے جس میں حقیقت نے ایک افسانے کا روپ دھار لیا ہے۔ ایسے کتنے ہی ناقابل حل مسائل کی ناوک اندازی آج بھی قلب و جگر سے لہو مانگتی ہے اس نوع کی تلخیوں کا احساس صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو برہنہ پا ان خارزاروں سے گزرے ہیں۔ یہ قصہ نہیں ایک دلدوز چیخ ہے جو بے اختیار بلند ہوتی ہے اور جس میں نغمہ گر کا سا اہتمام لازم نہیں۔''

(نسیم کنجاہی، دیباچہ ''نئی دھرتی پرانے گیت'' مصنفہ رام لعل، صفحہ 4 تا 5)

فسادات کے بارے میں رام لعل کی کہانی ''ایک عورت تھی علاج غم دنیا تو نہ تھی'' نہایت اعلیٰ درجے کی تخلیق ہے جس پر نقادوں کی زیادہ توجہ نہیں گئی ہے۔ اس کہانی کا ایک کردار جو پورے ماجرے کا چشم دید راوی ہے بہت ہی حساس نوجوان ہے جس کے دل و دماغ پر فسادات

کے دوران میں ایک مسلمان عورت کی اجتماعی عصمت دری کے اس قدر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں کہ وہ اب کسی دوسری عورت کی طرف دیکھنے کی ہمت تک کھو بیٹھا ہے:

''ویراں کے بعد یہ دوسری عورت تھی جس نے میرے ذہن میں مستقل قیام کیا۔ چاہے اس کا وجود میں نے خود اس کا گلا گھونٹ کر ختم کر ڈالا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورت ابھی مری نہ تھی۔ وہ عورت مجھ سے جدا نہ ہوئی تھی اس واقعہ نے میرے ذہن میں ایک ایسا جمود قائم کر دیا کہ کسی عورت کو دیکھتے ہی مجھے وحشت ہونے لگتی۔ جو عورت بھی میرے سامنے آتی مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ ابھی چلتے چلتے لیٹ جائے گی اور ایک ہجوم بھاگ کر اسے گھیر لے گا اور پھر قطاریں بننی شروع ہو جائیں گی۔ میں عورت کی ذات سے خوف کھانے لگا۔ پہلے میں نے عورت کا اتنا بھیانک تصور نہیں کیا تھا۔ اس تصور سے بچنے کے لیے میں نے اپنے ایک نئے تصور کی آڑ لی۔ اپنے آپ کو بہلانے کے لیے جھانسہ دینے کے لیے ایک بہت ہی خوب صورت شوخ، نرم، نازک عورت کو اپنے تخیل میں جنم دیا اور اس کی پرورش کی۔ اس کی پرورش ابھی تک کرتا پھرتا ہوں۔ ویسے تو میرے ذہن میں بے شمار حسین عورتیں گھوم رہی ہیں۔ لیکن میں نے تمھیں بتا دیا ہے کہ ایسی عورتوں سے مجھے خوف آتا ہے اور جو نئی عورت میرے ذہن میں ابھری ہے اس سے مجھے ذرا ڈر نہیں لگتا اور مجھے یقین ہے کہ مجھے ایسی عورت کہیں نہیں مل سکتی لیکن میں چونکہ زندہ رہنا چاہتا ہوں اس لیے اس کا سہارا لیا ہے۔ دوسری عورتوں کی مانند تمھاری قربت کا احساس بھی میری موت کو میرے بہت قریب لا کھڑا کرتا ہے۔ میں نے اسی لیے تم سے دور دور رہنے کی سعی کی۔ لیکن تم میرے نزدیک سرکتی آئیں۔ میری روح پر چھا جانے کی مسلسل کوشش کرتی رہیں اور آج میں زچ ہو کر تمھیں یہاں گھسیٹ

لایا ہوں۔ تا کہ جس آگ کو تم سینے میں دبائے میرے پیچھے پیچھے گھوم رہی ہو۔ آج اُن شعلوں کو ٹھنڈا کر دوں۔ تمھاری آگ مجھے زندہ نہیں رکھ سکتی۔ بلکہ مجھے ایک ٹھنڈی موت کا احساس دیتی ہے۔ لو اب لیٹ جاؤ۔ یہ کپڑے اتار ڈالو اور پھر مجھے اجازت دو کہ تمھارا بھی گلا گھونٹ دوں۔ شاید اس طرح وہ عورت مکمل طور پر مر سکے شاید اس طرح میرا ذہن بھیانک الجھنوں سے دھل سکے اور ایک نئی صبح کی مانند نکھر جائے تم مجھ سے محبت کرتی ہو نا.....''

(''ایک عورت تھی علاج غمِ دنیا تو نہ تھی''، مشمولہ، انقلاب آنے تک، مصنفہ رام لعل، بنارس، صفحہ 66 تا 67، 1949)

رام لعل کی چار اور کہانیاں بھیڑیے، کھیتوں کی رانی، زہر تھوڑا سا اور نصیب جلی اپنے نقطۂ نظر سے صالح اقدار کی پاسداری بھی کرتی ہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر ناقدین کے مطابق ان پر کرشن چندر کے اثرات زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں جنھوں نے ''ہم وحشی ہیں'' کتاب لکھ کر اردو ادیبوں اور قارئین کو جذباتی طور پر کافی متاثر ہی نہیں کیا تھا بلکہ کسی حد تک ان کا ذہن بھی بدل کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رام لعل کی مذکورہ کہانیوں میں صحافت زدگی، بلند آہنگی اور سنی سنائی باتوں کی روداد نگاری کم ہے اور ذاتی طور پر ان تجربات کو جھیلنے کا احساس زیادہ ملتا ہے۔

''بھیڑیے'' کہانی میں رام لعل نے پاکستان کے ایک ایسے مسلم بزرگ کریم کو پیش کیا ہے جو اس کے پڑوسی کی بیٹی ہے اور جس کے ماں باپ اور دیگر عزیز و اقارب مارے جا چکے ہیں، اب اس کی پناہ میں ہے۔ وہ ہر قیمت پر اس کی جان بچا لینا چاہتا ہے لیکن گاؤں والے اور اس کی بیوی تک اس کے خلاف ہو گئے ہیں اور بالآخر اس کے راسخ ارادے کے ردعمل میں اس کی بیوی گھر چھوڑ کر چل دیتی ہے۔ ''زہر تھوڑا سا''، کہانی میں مغربی پنجاب کے ایک ادھیڑ عمر سکھ اسٹیشن ماسٹر کی ملاقات ایک ایسی مسلمان لڑکی سے ہوتی ہے جو اپنے اغوا کرنے والے ایک سکھ زمیندار کو زہر دے کر پاکستان چلی جانا چاہتی ہے۔ سکھ اسٹیشن ماسٹر اسے انڈیا میں متعین پاکستانی ڈپٹی ہائی کمشنر کے دفتر پر پہنچانے میں پوری مدد کرتا ہے لیکن ساتھ ہی اس سے التجا کرتا ہے کہ جب وہ پاکستان پہنچ

جائے تو وہاں اس کی دو بیٹیوں سے بھی جا کر ملے جنھیں وہاں کے ایک مسلم زمیندار نے اغوا کر کے اپنے گھر میں ڈال رکھا ہے وہ اس سے کہتا ہے کہ وہ اس کی لڑکیوں کے ہاتھ میں بھی چوری چھپے تھوڑا سا زہر پہنچا دے تا کہ وہ بھی اس جابر زمیندار کا خاتمہ کر سکیں۔

'نصیب جلی' بھی ریلوے ورکشاپ میں ملازم ایک شریف سکھ کاریگر کی کہانی ہے جو اپنے پڑوسی عبدالقادر جس کے پیچھے فسادی شکاری کتوں کی طرح لگے ہوئے تھے، اپنی بیمار بیوی کے ساتھ رضائی میں چھپا کر اس طرح جان بچالیتا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کے سینے پر کرپان رکھ کر کہا اگر فسادی یہاں آئیں تو انھیں یہ معلوم نہ ہو کہ رضائی کے اندر تم دو لیٹے ہوئے ہو۔ پھر برسوں بعد وہی عبدالقادر اجمیر شریف کے عرس میں ہندوستان آتا ہے۔ تو وہ اس سے بھی ملنے کا خواہش مند ہے۔ اس لیے کہ اسی نے اس کی جان بچائی تھی جبکہ سکھ کاریگر کی بیوی آج تک اس بات کو نہیں بھلا سکی کہ اس نے اپنے خاوند کے خوف سے ایک غیر مرد کو اپنے سینے کے ساتھ چپکا کر اس کی جان بچائی تھی۔

عام طور پر فسادات کے افسانوں کے بارے میں جو تنقیدی سرمایہ ملتا ہے اس میں کرشن چندر کے افسانوں کو جو ''ہم وحشی ہیں'' میں شامل ہیں زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ منٹو کے ''سیاہ حاشیے'' کے افسانے میں بھی موضوع بحث رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کرشن چندر کی طاقتور نثر نگاری انہی افسانوں میں بڑے عروج پر تھی۔ اسی لیے کرشن چندر کی آواز کو زیادہ توجہ سے سنا گیا اور اس کے بعد کی نسل کے لکھے ہوئے افسانوں کو زیادہ توجہ سے نہیں پڑھا گیا، جو تجربات کی حقیقت بیانی اور فن کاری کے اعلیٰ نمونے تھے ان پر کرشن چندر کی طرح صحافتی اور قدر جذباتی انداز کی پرچھائیاں موجود نہیں تھیں۔ لیکن رام لعل اور ان کی نسل کے افسانہ نگاروں جن میں انتظار حسین، جوگیندر پال، شوکت صدیقی، ستیش بترا، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور شامل ہیں، کی فسادات کے پس منظر پر لکھی ہوئی کہانیوں میں مہاجروں کی ذہنی نوآبادکاری کی اہمیت بہت زیادہ ہے جن کا ذکر کرشن چندر، بیدی، منٹو یا ان کے ہم عمر افسانہ نگاروں کے یہاں تقریباً نہیں ملتا۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ رام لعل اور ان کے ساتھی افسانہ نگار جن کا ذکر اوپر کیا گیا ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے ان تجربات سے خود گزرے، دوسروں کے مسائل کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اور انہی لوگوں کے درمیان رہ کر ان کی نوآبادکاری کے مسائل کا خود بھی حصہ بنے۔

رام لعل کے افسانے اُکھڑے ہوئے لوگ، ایک شہری پاکستان کا، قبر، ایک اور پاکستانی وغیرہ ایسے افسانے ہیں جنھیں اردو ادب میں اہم مقام حاصل ہو چکا ہے۔ ان افسانوں میں وہ سارے مسائل جو جڑوں سے اُکھڑے ہوئے لوگوں کو سالہا سال تک پیش آتے رہتے ہیں اور وہ ذہنی طور پر نئی سرزمین پر جا کر بھی آسودہ ہو جانے کے باوجود آباد نہیں ہو سکتے بلکہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق رہ جاتے ہیں اور اس سے نفسیاتی طور پر ان کی نئی نسلیں بھی بہر نوع متاثر رہتی ہیں۔ رام لعل نے بڑی خوبی سے پیش کیے ہیں۔

رام لعل کے سفرنامے

رام لعل کی زندگی دراصل مسلسل سفر سے عبارت ہے۔ انھوں نے برصغیر کے بڑے بڑے شہروں اور علاقوں کے سفر آزادی سے پہلے بھی کر لیے تھے جن میں غیر منقسم ہندوستان کے پشاور، تکسلا، راولپنڈی، لاہور جیسے شہر شامل تھے۔ آزادی کے بعد انھوں نے جموں وشملہ سے لے کر گجرات، کاٹھیاواڑ، بمبئی، مدراس، میسور، کلکتہ اور آسام تک متعدد شہروں بلکہ غیر ممالک کے بھی متعدد سفر کیے۔ اگرچہ یہ سفر ان کے ریلوے کی ملازمت سے تعلق رکھتا تھا لیکن جب رام لعل کے افسانوں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں متعدد ایسے افسانے مل جاتے ہیں جو واقعتاً ان کے کسی نہ کسی سفر کا نتیجہ ہیں۔ کوئی بھی حساس ادیب کسی پیشے سے متعلق کیوں نہ ہوں وہ اپنی تخلیقات کے لیے نئے نئے انوکھے موضوعات تلاش کر لیتا ہے۔

رام لعل کا واسطہ برصغیر کے مختلف علاقوں کے لوگوں سے پڑا جن کے رسم ورواج، طرز بود و باش، لباس، رہن سہن، انفرادی رویہ اور ان کی زبانیں مختلف النوع تھیں۔ ایسے تجربات نے رام لعل کے ذہنی افق کو وسعت عطا کی۔ رام لعل نے غیر ممالک کے بھی کئی سفر کیے جن میں ان کا سابق وطن پاکستان، نیپال، ناروے، سویڈن، ڈنمارک، انگلینڈ، سوویت روس، مغربی جرمنی، سوئزرلینڈ راور فرانس شامل تھے۔ ان میں سے بعض ممالک میں تو وہ ایک سے زیادہ بار گئے رام لعل کے سارے دورے ادب کے وسیلے سے تھے۔ کہیں سمینار تھے، کہیں کتابوں کی رونمائی کی

تقریبات تھیں اور کہیں کہیں محض سیر و سیاحت کا شوق کارفرما تھا لیکن اس کے لیے بھی اردو ادب اور بیرون میں رہنے والے اردو ادیب ہی ان کے لیے بہت بڑا وسیلہ بنے۔ کسی بھی نئے معاشرے کو جب کوئی ادیب پہلی بار دیکھتا ہے، تب وہ چونک اٹھتا ہے اس لیے کہ مشرق و مغرب میں سماجی سطح پر بہت فرق ہے۔ رام لعل نے اپنے سفروں کے بارے میں چار اہم سفرنامے تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے ساری روداد اپنے مخصوص افسانوی انداز میں لکھی ہے جسے کوئی بھی قاری افسانوں جیسی دلچسپی کے ساتھ پڑھتا چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ رام لعل کی عادت تھی کہ وہ ہر شخص سے بہت جلدی گھل مل جاتے تھے اور جس شخص سے بھی وہ ہم کلام ہوتے تھے تو اس کی ذاتی زندگی سے متعلق باتوں اور اس کے رویوں وغیرہ میں کوئی نہ کوئی افسانہ تلاش کر ہی لیتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے سفرنامے بھی افسانوی فضا کی وجہ سے خاصے اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر چہ انھوں نے ایسے کئی مضامین بھی تحریر کیے ہیں جن کا تعلق مغربی ممالک کی فضا اور وہاں کے لوگوں سے ہے۔

ناروے کے بارے میں لکھے ہوئے سفرنامے ''خواب خواب سفر'' میں وہ ایک نارویجین خاتون سے اپنی ملاقات کا حال اس طرح لکھتے ہیں:

> ''اس نے مجھے چائے پلانے کی پیش کش کی اور ہم اوپر کی منزل پر بنی ہوئی ایک صاف ستھری کینٹین میں جا بیٹھے۔ کینٹین میں بھی کئی لڑکیاں موجود تھیں۔ نان اسموکنگ اور اسموکنگ دو الگ الگ کمرے تھے۔ کینٹین کی انچارج بھی ایک خاتون تھی۔ وہاں بھی دو اسٹینڈوں پر رسالے اور اخبار سجے ہوئے تھے۔ نارویجین اور انگریزی زبانوں کے۔ وہ میرے لیے چائے اور کھانے کی کئی چیزیں ایک ٹرے میں رکھ کر لے آئی۔ میں اس کی طرف مسرور ہو کر دیکھتا رہا۔ گھسی ہوئی جینز کے اوپر اس نے ایک کھلا کھلا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ اس کے چہرے کے دونوں طرف بکھرے ہوئے بال ایک سنہرا ہالہ سا بنائے ہوئے تھے۔ ہم جلدی ہی باتوں میں کھو جاتے ہیں۔ میرے بارے میں پوچھتے پوچھتے وہ اپنے بارے میں بھی یہ بتانے

میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتی کہ وہ اپنے شوہر سے طلاق لے لینے
کے بعد اب ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ رہ رہی ہے۔ جس کا چار ماہ کا
بچہ اس کے پیٹ میں پل رہا ہے۔ ابھی ان کا شادی کر لینے کا کوئی
ارادہ نہیں ہے۔ اسے اپنے بوائے فرینڈ پر پورا اعتماد ہے جو کسی فرم
میں الیکٹرک مکینک ہے کیٹ کا باپ ایک کان میں کام کرتا ہے
جہاں سے تانبہ نکلتا ہے۔ اوسلو سے کئی سو میل دور مشرقی علاقے
میں۔ اس نے پوچھا ''کیا ہندوستان میں بھی عورتیں اور مرد شادی
کیے بغیر ساتھ رہتے ہیں؟'' میں نے اسے بتایا۔ ''میں ایک فرینڈ کو
جانتا ہوں جو اتفاق سے شاعر ہے۔ وہ کئی برسوں سے اپنے سے عمر
میں بڑی ایک خاتون کے ساتھ رہ رہا ہے جو اس کی بڑی مداح ہے
لیکن ہمارے یہاں اس قسم کے انحراف کی مثالیں ابھی کم ہیں کیونکہ
اس کے لیے نہ سماج تحفظ دیتا ہے نہ قانون!''

(''خواب خواب سفر'' مصنفہ رام لعل، صفحہ 52 تا 53)

غیر ممالک کے سفروں کے دوران رام لعل کی ملاقات کئی نارویجین، ڈینش اور سویڈش خواتین و مردوں سے ہوتی ہے۔ لیکن اس سفرنامے میں ان تارکینِ وطن کا زیادہ ذکر ہوا ہے جو روٹی روزی کی تلاش میں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا سے وہاں گئے ہوئے تھے۔ رام لعل نے ایسے متعدد افراد کے بارے میں بھی خاصی تفصیل سے لکھا ہے، جو غیر ملکی معاشرے میں خود کو مدغم نہیں کر سکے اور جنھیں اپنے وطن کی یاد بھی اپنی طرف کھینچتی ہے لیکن وہ غیر ممالک کے نسلی امتیاز کو بھی اس لیے برداشت کرتے رہتے ہیں کہ وہاں انھیں روٹی روزی کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ ان اسفار میں رام لعل کی ملاقاتیں جن جن لوگوں سے ہوئیں، ان کے مخصوص مسائل و معاملات کو بغور دیکھنے، سمجھنے اور ان کی روح تک پہنچنے کی انھوں نے بھرپور کوشش کی۔ مثال کے طور پر ان کے سفرنامے کے یہ جملے دیکھیے:

''اسی لفٹ میں تین پاکستانی لڑکے بھی ملے۔ لاہور کے
اطراف کے۔ شلواروں اور قمیضوں میں ملبوس خوب صورت،

تندرست۔ان کے ساتھ ایک نارویجین خاتون تھی، رات بھر گاتے
بجاتے رہے تھے،لیکن تھکن نام کو بھی نہ تھی ان کے چہروں پر۔"
("خواب خواب سفر" مصنفہ رام لعل، صفحہ نمبر 69)

رام لعل وہاں کی فارن ورکرس اسوسی ایشن کے سکریٹری کرشنن کے حوالے سے بتاتے ہیں۔ان کی اسوسی ایشن میں پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور افریقی ممالک کے اَن گنت لوگ شامل تھے۔وہ سب ناروے کے مختلف کارخانوں، جہازوں، دفتروں، ہوٹلوں اور بسوں میں کام کرتے تھے۔اسوسی ایشن ان کی تنخواہوں کے گریڈ، کام کرنے اور مکانات سے متعلق جملہ سہولیات اور مسائل کے حل کے لیے حکومت کے مختلف شعبوں کے ساتھ میٹنگیں کرتی رہتی تھی۔ان کا ایک اخبار بھی انگریزی اور نوشک میں مہینے میں ایک بار نکلتا تھا لیکن کبھی کبھی اردو میں بھی اسے چھاپ دیا جاتا تھا۔کرشنن نے ان کے ساتھ پاکستان اور ہندوستان کے لوگوں کی ناروے کی سوسائٹی میں ثقافتی سطح پر مدغم نہ ہو سکنے کے مسائل پر بھی گفتگو کی اور اس سلسلے میں ان کی ناکامی کے اسباب اس طرح بیان کیے:

1۔"یہ لوگ یہاں کی مقامی لڑکیوں کے ساتھ عشق تو
کر سکتے ہیں لیکن ضرورت آنے پر ان کے ساتھ گھر بسانے سے گریز
کرتے ہیں۔

2۔یہ لوگ ہمیشہ اپنے گھر واپس چلے جانے کے خواب
دیکھتے رہتے ہیں۔اس لیے یہاں کی مقامی عورتیں ان پر اعتبار
نہیں کرتیں۔

3۔یہ لوگ اچھی آمدنی کے لالچ میں چھوٹے سے چھوٹا
کام تک کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔مثلاً خاکروب کا، فرش اور
موٹریں دھونے کا، بیرا گیری وغیرہ اور اپنے عزیزوں کو بھی ان کی
تعلیم چھڑوا کر وطن سے بلا لیتے ہیں جنھیں یہاں آ کر ایک جذباتی
صدمہ سا محسوس ہوتا ہے۔"

ایک جگہ رام لعل نے ایک اجنبی خاتون سے اپنی ملاقات کا حال اس طرح

بیان کیا ہے:

''صبح لوکل ٹرین میں کرنکشا سے نیشنل تھیٹر جاتے ہوئے ایک بونے سے قد کی سانولی لڑکی دکھائی دی۔ جس نے اپنے لمبے سیاہ بال ایک پیلے ربن سے باندھ رکھے تھے۔ وہ تنہا بیٹھی تھی۔ میں اسی کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اُس کی طرف مسکرا کر دیکھا تو وہ بھی مسکرادی۔ وطن سے ہزاروں میل دور اپنی ہی طرف کی ایک من موہنی مورت کی مسکراہٹ بہت ہی دلنشیں لگی۔ اس کی آنکھیں گہری کالی اور بڑی بڑی تھیں۔ وسیع اور عمیق سمندر جیسی۔ چند ہی منٹ میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ خاصے بے تکلف ہو گئے۔ اس کا نام سپنا رحمٰن تھا۔ وہ ڈھاکہ کی رہنے والی تھی۔ برنا ہاگن میں سروس کرتی تھی۔ اس کا شوہر یونیورسٹی میں اکنومکس کا کورس کر رہا تھا۔ کبھی کبھی گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ بھی پارٹ ٹائم جاب لے لیتا تھا۔ سپنا کو اوسلو میں آئے تین سال ہو چکے تھے۔ اگلے دو برسوں میں وہ کسی بھی وقت بنگلہ دیش لوٹ جانا چاہتی تھی۔ کم سے کم پانچ سال کے لیے۔ ہندوستان میں اس کی کئی فرینڈز ہیں ان سب سے ملتی ہوئی وہ ڈھاکہ جائے گی۔ اسے یہاں کے لوگ اچھے نہیں لگے۔ اس لیے اسے اپنے وطن کی یاد بہت ستاتی ہے۔ اسے سنگیت اور شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔ رونا لیلیٰ اور ثمینہ یاسمین کی بڑی دلدادہ ہے۔ بشیر احمد، عبدالجبار، فردوس الرحمٰن کی بھی۔ کوی جسیم الدین، فرخ احمد، مائیکل مدھوسودن، اور صوفیہ کمال کی کویتائیں زبانی یاد ہیں۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں فخر سے چمک چمک گئیں۔ پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئیں''۔

دوران سفر رام لعل کی ایک فلسطینی عورت سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا حال سنیے:

''پینتیس چھتیس سال کی دبلی پتلی سفید رنگت والی

چھوٹے سے قد کی اس عورت کا نام نادرہ مسروری تھا۔ اس نے اپنے بالوں کو بھورے رنگ میں ڈائی کیا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریڈ وائن کا گلاس تھا اس نے مجھ سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور بلا پوچھے بتانے لگی۔ میں آج ہی صبح جارڈن سے لوٹی ہوں، وہاں میری شروع کے زمانے کی بہت سی نظمیں اور پینٹنگس رکھی تھیں، میری بوڑھی چچی کے پاس۔ میں نے سوچا وہ بہت بیمار رہنے لگی ہیں، اٹھالاؤں، یہاں دو ہفتے کے بعد میری نئی پینٹنگس کی نمائش ہوگی۔ اسی میں پرانی پینٹنگس بھی رکھ دوں گی۔ اور پہلے دن جو فنکشن ہوگا اسی موقع پر اپنی کچھ نظمیں بھی دوستوں کو سنادوں گی۔ لیکن غضب یہ ہوا، میرے دونوں پیکیٹ جن میں نظمیں اور پینٹنگس تھیں ایر سروس والوں نے گم کر دیے۔ دونوں پیکیٹ میرے سامنے بیروت سے لوڈ کیے گئے تھے۔ اب وہ کہتے ہیں ٹرانزٹ میں پتہ نہیں ماسکو، کراچی، لندن یا فرینک فرٹ چلے گئے ہیں۔ ہر جگہ ٹیلیکس سے پوچھا جا چکا ہے۔ کہیں سے بھی امید افزا جواب نہیں آیا ہے آپ سمجھ سکتے ہیں میں کس قدر پریشان ہوں۔ میرا تو ذہن ہی ماؤف ہو چکا ہے۔''

رام لعل کو اسی سفر میں راولپنڈی کی ایک لڑکی سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا۔ اس کے ساتھ جو باتیں ہوئیں وہ بھی ملاحظہ ہوں:

''اس کا نام یاسمین تھا اور اس کے شوہر کا خالد رشید، جو ایک ریستوراں میں ملازم تھا۔ اس کے والد پہلے وائرلیس افسر تھے۔ اب ریٹائر ہو کر راولپنڈی میں ریڈیوز کا کاروبار کرتے ہیں۔ اس کی چار بہنیں اور دو بھائی تھے۔ تین بڑی بہنیں بیاہی ہوئی۔ سب سے چھوٹی بہن کو غیر ممالک میں گھومنے کی بڑی خواہش ہے۔ لیکن وہ ابھی تک اپنی آرزو پوری نہیں کر سکی۔ یاسمین نے کہا۔ اس بے وقوف لڑکی کے خواب بھی ایک روز چکنا چور ہو جائیں گے۔ جس دن بھی

غیر ممالک میں رہنے والے کسی مرد کے ساتھ بندھ کر پاکستان سے
چلی آئے گی۔ یاسمین کے کڑوے لب و لہجے کے پیچھے اس کی ہوم
سِک نیس جھانک رہی تھی..... اس نے اعتراف کیا۔ یہاں رہ کر
احساسِ کمتری محسوس ہوتا ہے۔ اس سے نکلنا مشکل ہے۔ زبان بھی
ایک مسئلہ ہے۔''

رام لعل کے ایک عزیز دوست ہرچرن چاؤلہ کے تعاون سے جب اس سفرنامے کی تعارفی تقریب اوسلو میں منعقد ہوئی تو وہاں کے ایک اردو ادیب، سعید انجم نے اس موقع پر ایک مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا:

''آج کی تعارفی تقریب میں ایک نیا پن ہے۔ حالانکہ
اوسلو کے لیے رام لعل نیا نہیں اور رام لعل کے لیے اوسلو پرانا ہے آج
کتاب پر رائے سکہ بند ناقد دے گا، نہ پیشہ ور مبصر آج کردار بولیں
گے۔ قاری بولیں گے کہ کردار بھی ہیں۔ آج تارکینِ وطن بولیں گے
کہ خواب خواب سفر ان کے پردیس میں قیام کی تاریخ بھی ہے اور
ان کے اجتماعی تجربات اور خیالات کی تصویر بھی۔ آج ایک مصنف
اور اس کے کچھ کردار مل کر اپنا اپنا ریکارڈ چیک کریں گے۔
اِدھر راجات کی پڑتال ہوگی۔ ایسا اتفاق اردو سفرنامے میں پہلے کہاں
ہوا؟ پہلے سفرناموں کے کرداروں کو معلوم ہی نہیں کہ وہ کس شکل میں
کتابوں میں موجود ہیں۔''

(''قصہ رام لعل کی بازو والی خالی سیٹ کا'' مضمون از سعید انجم، رام
لعل: فن اور شخصیت: مرتبہ نریندر ناتھ سوز: دہلی، صفحہ 114)

اسی تقریب میں ناروے کے انیس احمد نے بھی رام لعل کے اس سفرنامے کے بارے میں ایک مقالہ پڑھا تھا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

''دراصل آج کا یورپ کسی اَتھاہ کھوہ پر بنا وہ خوب
صورت گنبد ہے جسے ہم یہاں رہنے والے اندر سے دیکھ رہے ہیں

اور باہر رہنے والے باہر سے۔ رام لعل نے نہ صرف اس گنبد کے اندر جھانک کر دیکھا ہے بلکہ باہر والوں کو بھی بتایا ہے اب تک سفرنامے لکھنے والے علی بابا چالیس چوروں کے غار میں صرف خزانوں کا پتہ ہی دیتے رہے ہیں۔ قاسم کی اس لاش کا ذکر کرنا دانستا بھول گئے جو ان خزانوں کے باہر صدر دروازے پر ٹنگی ہوئی ہے۔ ان سفرناموں کی بدولت کھل جا سم سم کا اسم اعظم سیکھ بہت سے مہم جو یہاں آئے اور قاسم بنے۔ ہمارے ادیب ان سفرناموں میں یہ بتانا بھی بھول گئے ہیں کہ جو غریب الوطن قاسم بننے سے بچ رہے وہ بڑے بڑے کپوں میں بند کسی مرجینا کے ابلتے تیل سے بے خبر اب بھی چور سوداگر کے اشارے کے منتظر بیٹھے ہیں۔ سفرنامہ لکھنا دراصل ایک بہت بڑا فن ہے جو ادب میں نہ صرف ایک صنف کی حیثیت سے مسلّم ہے بلکہ مختلف زبانوں کی تاریخ لکھنے کا بہت اہم مواد بھی چند سفرنامے ہی بنے۔ البیرونی، ابنِ بطوطہ اور مارکو پولو جیسے سیاح اگر اپنے سفر کی تاریخ مرتب نہ کرتے تو شاید بہت سے ادوار کا ذکر انسانی تاریخ میں شامل نہ ہو سکتا۔ رام لعل ابنِ بطوطہ نہیں ہے۔ تاہم اس نے ناروے میں تارکینِ وطن کی جُہد کرتی ہوئی جن نسلوں کا ذکر اپنے سفرناموں میں کیا ہے وہ جب مستقبل میں تاریخ کا حصہ بن جائیں گے تو ان کی تاریخ لکھنے کا بہت سا مواد یقیناً اس سفرنامے سے ہی حاصل کیا جائے گا۔''

(''خواب خواب سفر'' از انیس احمد، رام لعل: فن اور شخصیت، مرتبہ نریندر ناتھ سوز: صفحہ 128-127)

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات میں رام لعل کے سفرناموں کے افسانوی اندازِ تحریر پر محض اظہارِ خیال مقصود تھا کہ تبصرہ نگاروں نے اس کی افسانوی حسیت اور حقیقت پسندی کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی تحقیقی کتاب ''اردو ادب میں سفرنامہ'' میں رام لعل کے

سفرنامے ''خواب خواب سفر'' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''افسانہ نگار رام لعل نے ناروے۔ سویڈن۔ ڈنمارک اور لندن کا سفر اپنے دوست ہرچرن چاولہ کی دعوت پر 1978 میں کیا تھا۔ ان کا سفرنامہ ''خواب خواب سفر'' اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں گرد و پیش کی زندگی، دلچسپ واقعات و حادثات، اور خوش منظر مظاہرے کے علاوہ تارکینِ وطن کے مسائل کو سمجھنے کی کاوش بھی کی گئی ہے۔ مجاہد علی نے درست لکھا ہے کہ: ''خواب خواب سفر'' اردو کا پہلا سفرنامہ ہے جس نے یورپ کے سنہرے اور دلنشیں سحر کو توڑنے کی کوشش کی ہے اور ان مسائل کا ذکر کیا ہے جو تارکینِ وطن کی زندگی کا روگ بنے ہوئے ہیں۔''

اور یہ تاثر اتنا گہرا تھا کہ خود رام لعل نے محسوس کیا ہے:

''ان کی پہلی غیر ملکی یاترا اتنی زیادہ خوش گوار ہرگز ثابت نہیں ہوئی۔'' تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ رام لعل کا یہ سفر تلاش و جستجو کا سفر تھا۔ ان سے ملنے والا ہر شخص ان کے لیے ایک ایسا کردار تھا جسے وہ اپنے نئے افسانے کا موضوع بنا سکتے تھے انھوں نے اپنے ہر ملاقاتی سے کہانیاں حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکثر مقامات پر تو سفرنامہ ایک طویل مگر بامعنی انٹرویو کی صورت بھی اختیار کر جاتا ہے اور رام لعل اپنے مخاطب کے باطن کو کریدنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس دیکھیے:

''نیرا اب میرے ساتھ پنجابی میں گفتگو کرنے لگی۔ میں نے پوچھا ''تم شادی کب کرو گی؟'' ہنس کر بولی ''جب بھی موقعہ مل جائے گا!''

''کسی ہندستانی کے ساتھ؟''..... ''نہیں انکل کسی بھی غیر ملکی کے ساتھ کرلوں گی''..... ''ہندستانی سے کیوں نہیں؟'' اس نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگالیا۔ اس کی آنکھیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ پھر گلاس رکھ کر بولی۔..... ''ہندستانی لڑکے بڑے بیوقوف

ہوتے ہیں۔ وہ خود تو آزادی چاہتے ہیں، لڑکیوں سے ملتے بھی رہتے ہیں لیکن شادی کرنے کے لیے چھوٹی لڑکیوں کے متمنی رہتے ہیں جو یہاں تو ملنے سے رہیں۔ ہندستان سے کسی کو پھنسا کر لے آسکتی ہو؟ میرا مطلب ہے تمھارے ماں باپ یہ کوشش کریں''.....
بولی''مائی فٹ! وہاں سے کوئی آٹھواں درجہ پاس بدھو ہی تو مل پائے گا۔ ایڈجسٹمنٹ کیسے ہو پائے گی؟ یہاں عمر، نسل، رنگ، ہر چیز بھول کور اپنا لائف پارٹنر ڈھونڈنا پڑتا ہے''.....پھر اس کو پیچھے سے آکر کسی گورے رنگ کے لڑکے نے بانہوں میں بھر لیا۔.....وہ مسکرادی'' ہئی تم آگئے!''

رام لعل نے یورپی معاشرے اور بالخصوص تارکینِ وطن کے ذہنی کوائف کو سمجھنے کے لیے بھی کچھ جاننے کی کوشش کی ہے:

''مجھے ایک بوڑھے کے پاس بیٹھا دیکھ کر اچانک ایک خوشنما چہرے والی نرس آگئی جس کا نام ٹونے تھا۔ وہ اس بوڑھے کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی اور مسکرانے لگی۔ میں نے بوڑھے سے پوچھا۔''ایسے خوشنما چہروں کو دیکھ کر آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟'' یہ سن کر اس نے لڑکی کے گال پر ہلکی سی چٹکی لی اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔''اچھا لگتا ہے۔ خوشی محسوس ہوتی ہے لیکن بے چینی بھی کہ اس دنیا میں اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔''

علی جواد زیدی نے درست لکھا ہے کہ:

''رام لعل کی سفرنامہ نگاری کا یہ ایک بہت ہی خوشنما اور مفید کارنامہ ہے۔''

(''اردو ادب میں سفرنامہ''، ڈاکٹر انور سدید، نئی دہلی، 2012، صفحہ 395 تا 397)

اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید کے علاوہ بھی کئی دوسرے نقادوں (جن میں ڈاکٹر وزیر

آغا، پروفیسر محمد علی صدیقی، پروفیسر سلیم اختر، پروفیسر آغا سہیل وغیرہ شامل ہیں) کی آرا بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔

رام لعل نے روس کا سفر بھی کیا تھا۔ اپنے ایک سفرنامے ''ماسکو یاترا'' میں رام لعل وہاں کے کینٹین کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

> ''میں نے ادھر ادھر ٹہل کر کئی کمرے دیکھے ہیں۔ کھانے کا کمرہ، جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے ملا ہوا ایک باتھ روم، چائے کا کمرہ، بات چیت کرنے کے لیے ایک ہال الگ بنا ہوا ہے۔ جس میں ٹی وی بھی رکھا ہوا ہے۔ وہاں کئی آرام دہ صوفے اور کرسیاں پڑی ہیں۔ اوور کوٹ، ٹوپیاں، مفلر اور چھڑیاں لٹکانے اور بیگ و بریف کیس وغیرہ رکھنے کے لیے ایک کمرہ ہے۔ جہاں سامان لینے اور واپس دینے کے لیے ملازم موجود ہیں۔ ایک ریسیپشن روم الگ ہے۔ جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا ہے۔ میں پھر اپنی میز پر واپس آجاتا ہوں۔ ویلن تینا ابھی تک نہیں لوٹی ہے۔ وہ آدمی اب بھی وہاں موجود ہے۔ میں پھر اس کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں۔ اور بہت عجیب لگ رہا ہے کہ ہمارے درمیان پون گھنٹے میں ایک بار بھی بات نہیں ہوسکی ہے۔ کیا یہ ایک تجربہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے باخبر ہیں اور خاموش ہیں اور ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں۔ ہم ایک ہی طرح کے لوگوں کو آتے جاتے میزوں کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے گھور رہے ہیں۔ بے مقصد ہی۔ لیکن ان کے بارے میں ہمارے محسوسات یقیناً الگ الگ ہوں گے۔ یہ آدمی یہاں کے ماحول کے بارے میں، ان سب لوگوں کے رویوں کے بارے میں بھی مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ لیکن ہم ان کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے، جبکہ ہم دوسرے کے وجود سے غافل بھی نہیں ہیں۔ اچانک وہ سگریٹ بجھا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور قدرے جھک کے سلام کر کے

چل دیتا ہے۔ اب میں تنہا دوسروں کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ ایک خوب صورت عورت بوٹی کو کانٹے میں پھنسا کر اس پر سے گوشت کو دانتوں سے نوچتی ہوئی کتنی عجیب لگ رہی ہے۔ مرد بھی ایسا کرے تو مختلف نظر نہیں آئے گا۔ وہ عورت کو بھی اسی طرح کانٹے میں پھنسا کر ادھر ادھر گھما کر اس کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اسے کاٹنے اور اس کا رس چوسنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی عورت بھی یہی رول ادا کرتی ہے۔ یہاں کی عورتیں یورپ کی عورتوں کی طرح مرد کے برابر کی حصہ دار ہیں۔ لیکن عورت ہر جگہ نرم و نازک ہی نظر آتی ہے۔''

(ماسکو یاترا: رام لعل: سیمانت پرکاشن نئی دہلی، 1990 صفحہ 25-26)

اب ہم رام لعل کے ایک بہت اہم سفرنامۂ پاکستان ''زرد پتوں کی بہار'' سے ایک ایسا اقتباس پیش کرتے ہیں جو بجائے خود ایک مکمل افسانہ ہے۔ رام لعل نے آزادی کے بعد اپنے کھوئے ہوئے وطن اور جنم بھومی میانوالی (مغربی پنجاب) کا لگ بھگ بتیس برسوں کے بعد 1980 میں سفر کیا تھا جہاں وہ ایک مہینے تک قیام پذیر رہے۔ وہاں وہ اپنے اُس گھر میں بھی گئے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے اور جہاں رہ کر انھوں نے ہائی اسکول تک اپنی تعلیم پوری کی تھی۔ اس گھر کی یادیں ان کے ذہن سے کبھی محو نہ ہو سکیں۔ شدید جذباتیت کے ان لمحات کو رام لعل نے ان الفاظ میں قلم بند کیا ہے:

''جس مکان کے سامنے میں کھڑا تھا اس کا دروازہ میرے لیے کھول دیا گیا۔ وہاں رہنے والے دو پھل فروش بھائی عبدالعزیز اور عبدالرشید جو کرنال سے ہجرت کر کے وہاں بس گئے تھے پردہ کرا کے مجھے اپنے گھر میں داخل ہونے کے لیے مدعو کر رہے تھے۔ اڑوس پڑوس کے کتنے بچوں اور بڑوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ وہ سب میرے ساتھ ساتھ اندر گئے۔ میں بظاہر بڑی خاموشی سے لمبی ڈیوڑھی میں سے گزرا جس کی اب چھت غائب تھی۔ وہاں

پانی کا ہینڈ پمپ بھی موجود نہیں تھا جہاں بیٹھ کر میری دادی اور دوسری والدہ اپنے ہاتھوں سے کپڑے دھویا کرتی تھیں۔ اوپر کے حصوں کو دو سیڑھیاں جاتی تھیں جن کے نچلے حصے مسمار ہو چکے تھے۔ برآمدے کے چھوٹے چھوٹے سفید مینار اب اپنی حقیقی آب و تاب کھو چکے تھے۔ دو بڑے بڑے کمرے، ایک بڑی سی رسوئی، اوپر نیم چھتی جس میں میرے والد پاٹھ پوجا کیا کرتے تھے۔ اور ٹھیک اسی سائز اور طرز کے سیرے چھوٹے چچا کے کمرے اور سامنے میرے دادا اور دادی کا کمرہ جس کے سامنے کی رسوئی غائب تھی۔ جس چھپر کے نیچے ہماری گائیں بندھی رہتی تھیں وہ بھی اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ وہاں وہی ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا جسے میں ڈیوڑھی میں تلاش کر رہا تھا۔ اوپر ایک اور چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں ہماری مرغیاں رکھی جاتی تھیں۔ اس کی کھڑکیاں اینٹوں سے چُن دی گئی تھیں۔ میرے چھوٹے چچا نے ہی مجھے پہلے پہل مرغیاں ذبح کرنا سکھایا تھا۔ میں نے ہر طرف ایک عجیب سی اداسی سے دیکھا۔ جس دیوار کے ساتھ ہمارا تندور ہوا کرتا تھا وہ تو غائب تھا لیکن دیوار پر دھوئیں کا ایک نشان ابھی تک موجود تھا۔ وہیں دیوار کے ساتھ چکی کا ایک پاٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ اسی چکی پر میری دادی اور پردادی نے بھی برسوں تک اناج پیسا ہوگا اور ساتھ ساتھ کئی لوک گیت گائے ہوں گے۔ میں کتنے سارے لوگوں کی نظروں کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا۔ یہی وہ جگہ ہے، جہاں سے میرا ماضی شروع ہوتا ہے، جب میں چھوٹا تھا تو یہاں مٹی اور اینٹوں کے بنے ہوئے کمرے ہوا کرتے تھے۔ جس کے آنگن میں ایک بیروں کا گھنا پیڑ بھی ہوا کرتا تھا۔ پھر یہ جدید طرز کا مکان بنا لیا گیا تھا۔ میں اسی گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اسی گھر کو میں نے 28 دسمبر 1946 کو چھوڑا تھا۔ جب میں اپنی بیوی اور ایک ماہ کی بچی کو ساتھ لے کر لاہور گیا

تھا۔ میری بچی نے بھی اسی گھر میں جنم لیا تھا۔ اب وہ بیکانیر میں اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ اسی گھر سے میری پانچوں پھوپھیوں کی ڈولیاں اٹھائی گئی تھیں جن میں سے اب صرف ایک زندہ ہے۔ اسی گھر میں میرے والد اور چھوٹے چچا اپنی دلہنیں بیاہ کر لے آئے تھے۔ میری والدہ نے اِسی گھر میں دم توڑا تھا اور میرے جواں سال چھوٹے بھائی شام نے ٹی بی جیسے موذی مرض میں جان دی تھی۔ اب میرے والد اور چھوٹے اور بڑے چچا بھی حیات نہیں ہیں۔ میں ہی اپنے خاندان میں اب سب سے بڑا ہوں اور برسوں بعد اس گھر میں واپس آیا ہوں۔ جس کی مٹی کا ذرہ ذرہ میرے جسم اور دل و دماغ میں رچا بسا ہوا ہے۔ میں نے من ہی من میں اپنے پرکھوں اور مرحوم عزیزوں کو یاد کیا اور ان سے مخاطب ہوا۔ 'تم اگر موجود ہو۔ تم اگر دیکھ سکتے ہو تو گواہ رہنا ایک بار لوٹ کر آیا تھا۔ تم سب کو اسی فضا میں محسوس کرنے اور یاد کرنے کے لیے۔ میرے بعد شاید پھر کوئی نہیں آئے گا۔ میں تمھارے خاندان کا آخری فرد ہوں جو تمھارے نام سے اور تمھارے بنائے ہوئے اس گھر کے ساتھ ایک جذباتی تعلق محسوس کرتا ہوں۔ اگر کوئی اور شخص کبھی بھولے بھٹکے یا ارادتاً آیا بھی تو وہ میری طرح ہرگز نہیں سوچ سکتا ہوگا۔ وہ تم سب سے اور مجھ سے بہت مختلف ہوگا.....'' پتہ نہیں کیسے میری زبان سے نکل گیا ''مجھے اس گھر کی تھوڑی سی مٹی دے دو'' تو تین چار لڑکے لپک کر زمین کھودنے بیٹھ گئے۔ انھوں نے آناً فاناً پلاسٹک کی ایک تھیلی میں میری جنم بھومی کی مٹی بھر کر مجھے دے دی۔ میں نے لڑکوں کی آنکھوں میں آنسو بھی بھرے ہوئے دیکھے۔ یہ بچے کون ہیں؟ ان کے تو میں نے نام بھی نہیں پوچھے ہیں اور ان کے ساتھ تو میرا کوئی رشتہ ہی نہیں ہے، پھر یہ کیوں رو رہے ہیں! جبکہ میں خاموش ہوں۔

اپنے اوپر پورا قابو پائے ہوئے ہوں.....شاید مٹی کا رشتہ بھی اِک
رشتہ ہوتا ہے.....زبان کا رشتہ بھی ایک رشتہ ہوتا ہے.....''
(''زرد پتوں کی بہار'' مصنفہ رام لعل، مطبوعہ یوپی اردو اکادمی،
لکھنؤ، 1982)

اسی سفر سے لکھنؤ واپس لوٹتے ہوئے رام لعل نے اپنے پاکستانی دوست و افسانہ نگار انور سجاد سے کہا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں اپنے ملک سے ایک بار پھر ہجرت کر رہا ہوں۔ اوپر جو طویل اقتباس دیا گیا ہے اس کے بارے میں رام لعل کو ذاتی طور پر پروفیسر آل احمد سرور، احمد ندیم قاسمی، پروفیسر محمود الٰہی نے بڑے تعریفی خطوط لکھے تھے۔ مہاراشٹرا گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم نے بھی اسی طویل اقتباس کو ''مٹی کی خوشبو'' کے عنوان سے بارھویں جماعت کے اردو نصاب میں شامل کر رکھا ہے۔

رام لعل کے دوسرے سفرناموں میں جو ڈنمارک اور سویڈن کے بارے میں ہیں، بے شمار چھوٹے بڑے ایسے افسانے مل جاتے ہیں جنھیں سفرنامے کی روداد کہنا بڑی حد تک غلط ہوگا۔ اب ہم رام لعل کے چند ایسے افسانوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو انھوں نے بیرون ممالک کے سفر سے متاثر ہو کر وہاں کے کرداروں، ان کے مسائل، وہاں کی فضا کے بارے میں بڑے تخلیقی انداز میں اردو ادب کو دیے۔ اس ضمن میں ایک افسانہ ''پکھیرو'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جس میں رام لعل کی ملاقات فرانس کی ایک لڑکی اِیوا براؤن سے شملہ میں ہوتی ہے۔ اور اس کے برسوں بعد پھر اچانک سویڈن میں ہو جاتی ہے۔ وہ ایک آزاد خیال اور بے حد حساس واقع ہوئی ہے۔ ملکوں ملکوں کسی مہاجر پرندے کی طرح گھومتی پھرتی ہے مثلاً نیپال، افغانستان، ترکی، جرمنی، ڈینمارک وغیرہ میں۔ وہ اپنی ایک طویل ڈائری بھی لکھتی ہے۔ جو اتفاق سے رام لعل کے ہاتھ لگ گئی تھی اور انھوں نے اس کے بیشتر اقتباسات اس افسانے میں شامل کر کے اس لڑکی کی نفسیات کو واضح کیا تھا۔ آخر میں وہ لڑکی پھر بچھڑ جاتی ہے جب وہ مختلف ممالک کے قریباً تین پناہ گزینوں کو ایک اور ملک میں لے جا رہی تھی، جنھیں کوئی بھی ملک مستقل طور پر پناہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اس قافلے کے فرانسیسی بولنے والوں کی مترجم کے فرائض ادا کر رہی تھی، جن کے بارے میں اس نے بتایا:

''نسلی امتیاز کا شکار بھی ہوتے ہیں یہ لوگ۔ کوکلس کلاں اور اسکن ہیڈز نام کی دو تنظیمیں ہیں جو انھیں پریشان رکھتی ہیں۔ ان کے دروازوں پر نگر گو ہوم لکھ دیا جاتا ہے۔ سڑکوں پر تنہا پا کر ان کی مار پیٹ بھی کر دی جاتی ہے لیکن مقامی لوگ ان کا ساتھ نہیں دیتے۔ وہ بالکل غیر جانب دار رہتے ہیں۔ لیکن غیر جانب دار رہنے سے نسلی منافرت کا حل نہیں نکلتا۔ خانہ بربادوں کو فائدہ ہی کیا ملتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔''

(''زرد پتوں کی بہار'' مصنفہ رام لعل، مطبوعہ یو پی اردو اکادمی، لکھنؤ، 1982)

ظاہر ہے ان پناہ گزینوں میں پاکستانی، بنگلا دیشی، سری لنکن اور کچھ گریک بھی تھے جو اپنے وطن سے نکل کر غیر قانونی طور پر کسی بھی ملک میں جا کر آباد ہونا چاہتے تھے۔ رام لعل کا یہ افسانہ اردو کے اہم ترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اُن کا ایک اور افسانہ ''ہندستانی نژاد'' ایک ایسی لڑکی کے بارے میں ہے جو ڈراموں میں کام کرنے کی دلدادہ ہے لیکن اسے ہر ڈرامیٹک کلب کے ڈائرکٹر نے اپنی رکھیل بنانا چاہا یا اس کی مرضی کے بغیر اس کی عصمت پر ہاتھ ڈالا۔ وہ ایک حساس، فراخ دل اور تعلیم یافتہ لڑکی ضرور ہے لیکن اس کے اندر کی عورت اپنے لیے پورا احترام بھی چاہتی ہے۔ یہ لڑکی مغربی ممالک کے کئی شہروں میں بھٹکتی ہوئی بالآخر ناروے کے شہر اوسلو میں جا کر رہنے لگتی ہے جہاں وہ ایک ہیئر کٹنگ سیلون میں بال کاٹنے کی ملازمت حاصل کر لیتی ہے۔ وہاں اس کی ملاقات اِس کہانی (''ایک شہر ایک بدن'') کے راوی سے ہوتی ہے۔ ڈراموں سے دونوں کو رغبت ہے۔ دونوں ایک شام کو ایک ڈرامہ دیکھ کر لوٹتے ہیں تو راوی اس کی رفاقت کی خوشی سے مغلوب ہو کر اسے گلے لگا لیتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ ہم بستری بھی کرے لیکن وہ لڑکی اس کی چنگل سے نکل کر باہر سیڑھیوں پر جا بیٹھتی ہے اور بے تحاشہ سگریٹ پھونکتی رہتی ہے۔ اس کہانی کا راوی اپنے رویے پر متاسف ہوتا ہے تو وہ اس سے کہتی ہے:

''میں مردوں کی صرف اسی بات سے سخت نفرت کرتی

ہوں جب وہ اپنا بھاری بھرکم وجود عورت کے بدن پر زبردستی لاد دیتے ہیں جو گلیکر بھی اسی قسم کا ایک حیوان ہے جسے چھوڑ کر میں یہاں چلی آئی تھی۔ پتہ نہیں تم لوگوں کو سزا دینے کے لیے کب کوئی قانون بنایا جائے گا۔ اس کے لیے تو موت کی سزا ہونی چاہیے۔ بھوٹانی زندہ ہوتا تو میں اسے اپنے ہاتھوں سے گولی کا نشانہ بنا دیتی۔ مردوں سے نفرت کرنا مجھے اسی نے سکھایا ہے۔ شاید اب میں زندگی بھر اس نفرت سے چھٹکارا نہیں پا سکوں گی۔''

(افسانہ: ''ایک شہر ایک بدن'' مطبوعہ ''گزرتے لمحوں کی چاپ'': پاکستانی ایڈیشن، 1991)

مغربی پس منظر پر لکھی ہوئی رام لعل کی ایک اور قابل ذکر کہانی ''ناگ پھنی'' ہے۔ اس کہانی میں مرکزی کردار وہی فلسطینی خاتون نادرہ ناصری ہے۔ جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اور جس سے رام لعل کی ملاقات اوسلو میں ہوئی تھی۔ شاید رام لعل کو اس فلسطینی شاعرہ اور مصورہ کا کردار اتنا زیادہ پسند آ گیا کہ انھوں نے اس پر الگ سے ایک افسانہ بھی لکھ ڈالا۔

رام لعل نے اس افسانے کا آغاز اوسلو سے لندن تک کی ایک چارٹرڈ فلائیٹ سے کیا ہے۔ جس میں ان کی ہم سفر نادرہ ناصری کے علاوہ ڈنمارک کی ایک خاتون ایلیس میتھیلین بھی تھی جو ناروے میں کئی برس سے ایک ساؤتھ انڈین کے ساتھ بطور گرل فرینڈ رہ رہی تھی۔ جب رام لعل نے اوسلو میں اس فلسطینی خاتون کا تھوڑا سا ذکر کیا تو اس کا نام نادرہ مسروری لکھا تھا لیکن وہ اس افسانے میں نادرہ ناصری کے نام سے پیش کی گئی ہے۔ شروع میں اس کے مسائل وہی ہیں یعنی اس کی چچی کی زندگی کا اب کچھ بھروسہ نہیں ہے جس کے پاس اس کی کئی نظموں کے مسودے اور پینٹنگس رکھی تھیں۔ انھیں نادرہ نے وہاں جا کر دو پیکٹوں میں اوسلو کے لیے بک کرا دیا تھا لیکن دونوں پیکٹ راستے میں کہیں کھو گئے۔ رام لعل نے ایلس میتھیلین کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پونے چھ فٹ کے قریب اونچی تھی۔ اس کے اندر ایک مغربی عورت کا سارا بانکپن موجود ہوتے ہوئے بھی نخوت نام کو بھی نہیں تھی بلکہ اس کی نسوانیت کا وہ فطری انکسار زیادہ نمایاں تھا۔ جو مرد کے لیے مسرت اور اطمینان کا باعث بن جاتا ہے۔ رام لعل نے اس کے چہرے اور خدوخال کے

بارے میں لکھا ہے۔ اس کے ڈائی کیے ہوئے شعلہ رنگ بال اس کے کندھوں پر جھول رہے تھے لیکن ناروے کی زندگی سے وہ بہت زیادہ خوش نہیں نظر آتی تھی کیونکہ وہ بار بار اپنے ہی ملک کے ادب، آرٹ اور تھیٹر کی روایات کو برتر ثابت کرنے لگتی تھی۔ وہ کسی حد تک خود پسند بھی تھی۔ کیونکہ جب کہانی کے راوی نے یہ کہا کہ اس کی شکل گریٹا گاربو سے بہت ملتی ہے تو اس نے فوراً کہا کہ وہ بھی ڈینش تھی۔ اس خاتون نے ایک ریستوران میں ایک اور سفید فام عورت کو دیکھ کر بتایا کہ دس سال پہلے اس نے اچانک میرے شوہر ایرک گرمزرڈ کو اپنی طرف راغب کر لیا تھا۔ اسی کی وجہ سے ہمیں ایک دوسرے سے الگ ہونا پڑ گیا تھا۔ اب وہ کابل میں ڈپٹی کاؤنسلر ہے۔ دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ نہ پٹ سکی۔ وہ کسی ایک مرد کے ساتھ زیادہ عرصے تک وابستہ ہو کر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ صرف تجربے کرتی تھی۔ کہانی کے راوی نے ایلس کی باتوں میں حسد اور برہمی کی نشاندہی یہ کہہ کر کی ہے کہ نادرہ ناصری نے اب تک صرف چار بار باقاعدہ شادی کی ہے۔ ہر شادی بالآخر طلاق تک پہنچی اور اس کے دو بچے بھی ہوئے۔ دونوں کو اس نے دو الگ الگ ضرورت مندوں کے حوالے کر دیا۔ اس کا ایک بچہ اسی لندن میں زیر تعلیم ہے۔ وہ دراصل اسی کو دیکھنے کے لیے یہاں آئی ہے۔ گمشدہ سامان کی تلاش تو اس کی محض کریز ہے۔ وہ نہ بھی کھو گیا ہوتا تب بھی وہ کچھ نہ کچھ ضرور تلاش کرتی ہوئی نظر آتی۔

رام لعل نے اپنے افسانوں میں ان دونوں عورتوں کی نفسیات کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ نادرہ بے حد شراب پیتی تھی اور لندن میں سڑکوں پر اور زیر زمین ٹیوب لائن کے ریلوے پلیٹ فارموں پر کسی نہ کسی بینچ پر پڑی دکھائی دے جاتی تھی۔ دونوں عورتوں میں نادرہ ناصری کے کردار کے ساتھ ہی زیادہ انصاف ہو پایا ہے۔ کیونکہ وہ ایک بھٹکتی ہوئی افسردہ روح جیسی لگتی ہے۔ جسے کہیں بھی ایک پل کو چین نہیں۔ کہانی کے انجام پر ایلس ہی رام لعل کو بے حد گھبرائی ہوئی آواز میں بتاتی ہے:

> ''مجھے افسوس ہے کہ میں آج تمھارے ساتھ واپس نہ جا سکوں گی۔ ایک بہت بری خبر ہے۔ کل رات نادرہ ناصری مر گئی۔ وہ اچانک بیمار ہو گئی تھی اور اسے کوئی میڈیکل ایڈ تک نہ پہنچائی جا سکی۔ یہ سب بالکل اچانک ہو گیا۔ میں یہاں صرف اس لیے رک

رہی ہوں کہ پولس نے مجھے اطلاع دی ہے کہ انھیں نادرہ کی ڈائری
میں میرے نام کوئی تازہ نظم لکھی ہوئی ملی ہے۔
پتہ نہیں اس نے کیا لکھا ہوگا۔ نیم پاگل تو وہ تھی ہی۔ خیر
میں اب بعد میں آؤں گی۔ تب تک میں اس شاک سے بھی دور
ہو چکی ہوں گی۔''

(''ناگ پھنی'' افسانہ مشمولہ ''ڈوبتا ابھرتا آدمی'' رام لعل،
لاہور 1986)

اس سلسلے میں رام لعل کا ایک اور قابل ذکر افسانہ ''مڈنائٹ سن'' ہے جس میں کہانی کا راوی اوسلو کے ایک جزیرے پر ایک افسانہ نگار بوڑھی خاتون ماریہ سے ملتا ہے جو اگرچہ شادی شدہ ہے، لیکن وہ اپنے ماضی کے اس عشق کو ابھی تک نہیں بھلا سکی ہے جو اس کا قاری تھا اور جس نے اس کا ایک پورٹریٹ بنا کر اسے پیش کیا تھا وہ پورٹریٹ ابھی تک اس کے کمرے میں آویزاں تھا۔ کچھ عرصے بعد کہانی کے راوی کی ایک اور ملاقات اسی خاتون سے لیزی بو میں ہوئی۔ جہاں کہانی کا راوی ایک سمینار میں مدعو تھا۔ وہ وہاں صرف اسی سے ملنے کے لیے پہنچی تھی۔ اس بہتّر (72) سالہ خاتون نے کہانی کے راوی کے ساتھ کافی وقت گزارا، تمباکو نوشی کی، بے حد شراب پی اور اسے اپنی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتایا:

''میری ماں ایک جپسی قبیلے کی عورت تھی۔ لوگ اس سے
بہت نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اسے ایک جادوگرنی ہی سمجھتے تھے۔
بلکہ ایک چڑیل، جو دوسروں کے بچے اٹھا لے جاتی ہے۔ لوگوں کو تنہا
پا کر ان کے کلیجے چبا جاتی ہے۔ وہ یہ سب نہیں کرتی تھی تب بھی لوگ
اسے اپنی آبادیوں کے نزدیک نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ ایک بار اسے
بہت پیٹا گیا تھا۔ لوہے کے ڈنڈوں سے اور پتھروں سے۔ وہ ایک
جرمن کسان کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی اس سے راتوں کو چھپ
چھپ کر ملنے کے لیے کتنے پہاڑی جنگلوں میں سے ہو کر پہنچ جاتی
تھی۔ میں ان ہی دونوں کی مخلوط اولاد ہوں۔ تم نے میری آنکھوں

میں شاید غور سے جھانک کر نہیں دیکھا میری دونوں آنکھیں ایک سے
رنگ کی نہیں ہیں۔ یہ مکسڈ بلڈ کا نتیجہ ہے۔"
("مڈ نائٹ سن": افسانہ مشمولہ: "سدا بہار چاندنی" مصنفہ رام لعل،،
نئی دہلی، 1986)

اس افسانے میں رام لعل نے ایک معمر غیر ملکی افسانہ نگار خاتون کے اندرونی کرب کو حقیقی اور بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

یوں تو رام لعل نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد بھی پاکستان کے پس منظر پر کئی افسانے تحریر کیے ہیں۔ جن میں 'ہسٹری شیٹر'' اور ''ایک شہری پاکستان کا'' بہت مقبول ہوئے لیکن ان کا ایک اور افسانہ ''ایک ہزار بچوں والی ماں'' بھی اس لیے قابل ذکر ہے کہ یہ ایک تو وہاں کے بیس سال بعد سفر کا نتیجہ ہے دوسرے اس میں رام لعل کا نوسٹلجیہ (Nostalgia) اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ ''ایک ہزار بچوں والی ماں'' دراصل رام لعل کے آبائی شہر کی ایک مسلمان دائی 'بختاں' ہے جس نے رام لعل کے والد اور ان کے بہنوں بھائیوں کو بھی پیدا کرایا تھا۔ رام لعل نے اسے ہمیشہ اماں کہہ کر مخاطب کیا اور اس کی یادیں ان کے ذہن سے کبھی محو نہ ہو سکیں۔ جب رام لعل لاہور میں رہائش پذیر تھے اور وقتاً ضرورت کبھی کبھی اپنے ماں باپ سے ملنے کے لیے میانوالی جاتے تھے تو اپنی دائی اماں سے ملنا کبھی نہیں بھولتے تھے:

''چھٹیوں میں گھر آنے کے پہلے ہی روز میں اسی میدان کی طرف چلا گیا تھا۔ اگر چہ اب میرے بچپن کا کوئی بھی ہمجولی وہاں موجود نہیں تھا۔ میری طرح سب بڑے ہو کر ادھر ادھر تعلیم و تربیت اور معاشی جدوجہد میں سما گئے تھے۔ بختاں کا پوتا قادر تک فوج میں بھرتی ہو کر کسی دور کی چھاؤنی میں جا کر رہنے لگا تھا۔ مجھے دیکھ کر بختاں کا جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا تھا۔ اس نے کہا ......پتّر تو اب لاہور میں پڑھتا ہے نا! بہت بڑا ضلع افسر بن کر دکھانا۔ میں میاں ذکری کے مزار پر تیرے لیے منّت مانگوں گی۔ اس کی دعاؤں سے متاثر ہو کر میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک ہی

سکہ ہاتھ لگا اور اس کی مٹھی میں دے دیا جسے محسوس کر کے وہ خوش ہو کر
بولی.....''اللہ تیری کمائی میں برکت دے'' پر یہ تو پوری چونّی ہے۔
اتنی ساری مجھے کیوں دے رہا ہے۔؟''

(''ایک ہزار بچوں والی ماں'' افسانہ مشمولہ ''ڈوبتا ابھرتا آدمی'':
رام لعل، مطبوعہ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،)

اردو کے افسانوی ادب کا دامن ابھی تک ایسے افسانوں سے خالی تھا جو دوسرے ممالک کے پس منظر پر لکھے گئے ہوں اور انھیں لکھنے والے ہندستانی تخلیق کار ہوں۔ اس کمی کو سب سے پہلے رام لعل نے پورا کیا۔ ان کے مذکورہ بالا افسانے ان کے مشہور و معروف بعض افسانوں سے بھلے ہی زیادہ بڑے نہ ہوں پھر بھی ان کی اہمیت یقیناً اس بات میں بھی مضمر ہے کہ انھی افسانوں کے ذریعے ہم دوسرے ممالک کی رسموں رواجوں، رویوں، معاشرتی زندگی اور ان سب کے درمیان زیست کرتے ہوئے ہندستانی اور پاکستانی باشندوں کی زندگی کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔

ادبی مقام

رام لعل کا شمار اردو ادب کے مقبول عام افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں وہ کرشن چندر اور اے حمید کی صف کے ادیب ہیں۔ اگر چہ کرشن چندر جیسی بے پناہ عوامی شہرت اور مقبولیت ان کے حصے میں نہیں آئی اور نہ ہی کرشن چندر کی طرح ان کا شمار صف اول کے اردو افسانہ نگاروں میں کیا گیا تاہم انھوں نے جو کچھ لکھا اور جتنا کچھ لکھا وہ ان کی عوامی شہرت اور مقبولیت کا باعث بنا اور کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور راجیند رسنگھ بیدی جیسے اردو افسانے کے لیجنڈس کے بعد ابھرنے والی نسل کے اہم افسانہ نگاروں میں ان کا شمار کیا جاتا رہا ہے۔

رام لعل نے اپنا اولین افسانہ 1943ء میں لکھا تھا جو اُسی سال لاہور کے اردو ہفت روزہ "خیام" میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے کا عنوان "تھوک" تھا۔ اس کے دو سال بعد ہی رام لعل کے افسانوں کا اولین مجموعہ "آئینے" عنوان سے شائع ہوا۔ جسے اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے تین سال بعد یعنی 1947 میں رام لعل کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "انقلاب آنے تک" عنوان سے شائع ہوا۔ یہ وہ دور تھا جس میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اور ترقی پسند افسانہ ایک سنہری دور کی تشکیل کر رہا تھا۔

رام لعل کا تعلق نچلے متوسط گھرانے سے تھا اور تقسیم وطن سے کچھ عرصے پہلے ہی وہ بہ سلسلۂ ملازمت اپنی جائے ولادت میانوالی سے لاہور منتقل ہو چکے تھے۔ یہاں محنت کش طبقے

کے لوگوں سے ان کے شب و روز کے تعلقات اور حساس طبیعت نے انھیں ٹریڈ یونین اور مزدور طبقے سے وابستہ کیا۔ یہیں وہ اشتراکی فلسفے سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی تخلیقات میں بھی اس کا اظہار کرنے لگے۔ ان کے بیشتر افسانے مارکسی فکر و فلسفے سے متاثر اور مملو نظر آتے ہیں۔

رام لعل کے اولین افسانوی مجموعے کا پیش لفظ مشہور ترقی پسند افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا اور اس پیش لفظ میں انھوں نے رام لعل کی مارکسی طرز فکر کو سراہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رام لعل فکر و اظہار کی سطح پر اپنے ابتدائی دور سے ہی ترقی پسند افکار و نظریات سے متاثر رہے ہیں۔

رام لعل نے اردو زبان و ادب کو پانچ سو سے زیادہ افسانے دیے۔ اس طور اپنی تخلیقات کے ذریعہ اردو افسانے کی ترویج و ترقی میں ایک اہم رول ادا کیا۔ ان کے افسانے پڑھنے اور پسند کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ رہی ہے۔ رام لعل نے افسانوں کے علاوہ ناول، ریڈیو ڈرامے، مضامین، سفرنامے، خاکے اور ادبِ اطفال وغیرہ کئی میدانوں میں اپنی خداداد صلاحیتوں کے جوہر دکھائے اور اپنی ان تحریروں کی بنیاد پر اردو ادب میں اہم مقام حاصل کیا۔ ان کی تخلیقی عمر نصف صدی سے کچھ زائد ہی رہی ہے۔ تخلیقی زندگی کے پچاس سال پورے کر لینے پر اہل لکھنؤ نے رام لعل کی پچاس سالہ تخلیقی زندگی پر ایک زبردست جشن کا اہتمام کیا تھا۔ یہ بھی رام لعل کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا ایک ثبوت کہا جا سکتا ہے۔

رام لعل کے افسانوی مجموعوں کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کیونکہ ان کے افسانوں کے کئی جعلی ایڈیشن بھی شائع ہوئے ہیں اور پاکستان میں ان کے افسانوں کے کئی ایسے مجموعے بھی شائع ہوتے رہے ہیں جن میں ان کے گذشتہ مجموعے سے افسانے لے کر نئے ناموں سے نئی ترتیب کے ساتھ شامل کر دیے جاتے تھے۔ خود رام لعل کے مرتبہ افسانوی مجموعوں کی وہ فہرست جو انھوں نے اپنے بائیوڈیٹا میں شامل کی تھی وہ درج ذیل ہے۔

آئینے 1945، انقلاب آنے تک 1949، وہ مسکرائے گی 1952، نئی دھرتی پرانے گیت 1958، گلی گلی 1960، آواز تو پہچانو 1962، چراغوں کا سفر 1966، کل کی باتیں 1966، انتظار کے قیدی 1966، اکھڑے ہوئے لوگ 1972، گزرتے لمحوں کی چاپ 1973، معصوم آنکھوں کا بھرم 1973، رام لعل کے منتخب افسانے 1974، سدا بہار چاندنی 1982، ڈوبتا ابھرتا

آدمی 1988، ایک اور دن کو پرنام 1990۔

افسانہ نگاری کے مقابلے میں ناول نگاری اگر چہ ایک مشکل فن ہے۔ افسانہ ایک یا دو تین نشستوں میں لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ناول کی تکمیل بہت وقت اور فنی مہارت کی متقاضی ہوتی ہے۔ رام لعل نے بھر پور تخلیقی زندگی گزاری ہے اور وہ افسانہ نگاری کے علاوہ دوسری اصناف میں بھی مسلسل طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ ان کے ناولوں کی تعداد اگر چہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ تاہم انھوں نے جو ناول لکھے ہیں وہ اردو ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے اور ان کی خاصی پذیرائی بھی ہوئی۔ مٹھی بھر دھوپ 1972، کہرا اور مسکراہٹ 1973، نیل دھارا 1980 اور سورج جیسی رات 1984 وغیرہ اردو ناول نگاری کو رام لعل کی دین کہے جا سکتے ہیں۔ رام لعل نے گاہے بہ گاہے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جو اردو کے افسانوی ادب سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم عصر مسائل و معاملات پر ان کے آزادانہ اظہار خیال سے عبارت ہیں۔ یہ مضامین جہاں رام لعل کے تنقیدی شعور کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں وہیں فن افسانہ و ناول جدید و قدیم افسانہ نگاروں اور دیگر ادبی مسائل سے متعلق ہماری فہم کو مہمیز کرتے ہیں۔ جدیدیت کے دورِ عروج میں ''افسانے کی حمایت میں'' عنوان کے بہانے دراصل صنف افسانہ کی مخالفت کی جو کوششیں شروع ہوئی تھیں رام لعل اور ان کے چند ہم عصروں نے ان کے مدلل جوابات دینے کی سعی کی تھی۔ رام لعل کے مضامین میں ان سب کی تفصیلات بھی موجود ہیں۔ رام لعل کے منتخب تنقیدی مضامین "اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا" نامی کتاب میں یکجا کر دیے گئے ہیں جو ان کے ہم عصر اردو افسانے کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

رام لعل بنیادی طور پر افسانہ اور ناول نگار ہیں۔ وقت ضرورت انھوں نے تنقیدیں بھی لکھی ہیں اور اپنے عہد کے چند نمائندہ شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں پر اپنے ذاتی تعلقات، خیالات اور تجربات کی بنیاد پر کئی مضامین بھی لکھے ہیں جو نہ تو خاکے ہیں، نہ ہی ان کے کوائفِ حیات اور نہ ہی ان کی فکر و فن پر تنقیدی مقالات کہے جا سکتے ہیں بلکہ ان میں مذکورہ بالا خصوصیات گڈ مڈ ہو گئی ہیں۔ بہر حال ان مضامین کو رام لعل کے ہم عصر شاعروں ادیبوں اور نقادوں کے بارے میں اہم معلومات کا ایک معتبر ذریعہ ضرور قرار دیا جا سکتا ہے ان شخصیات میں فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، تلوک چند محروم، قتیل شفائی، فہمیدہ ریاض اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

جیسے شعرا بھی ہیں اور سید احتشام حسین، سید سجاد ظہیر جیسے ناقدین اور کرشن چند، راجیند رسنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، علی عباس حسینی، اوپیندر ناتھ اشک اور مہیند رناتھ وغیرہ جیسے نامی گرامی افسانہ و ناول نگار بھی ہیں۔ راجا مہدی علی خاں، احمد جمال پاشا وغیرہ جیسے مزاح نگار بھی ہیں۔ جن کے ساتھ اپنی بہت ساری یادیں رام لعل نے قلمبند کر دی ہیں۔ ان خاکہ نما مضامین کا ایک مجموعہ ''دریچوں میں رکھے چراغ'' عنوان سے 1951 میں شائع ہو چکا ہے۔

رام لعل ایک ہمہ جہت فن کار ہیں۔ انھوں نے جہاں ایک طرف اردو کی کئی اصناف نثر میں یادگار سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے وہیں ادبِ اطفال کے میدان میں بھی قابلِ قدر کام کیا ہے۔ رام لعل نے بچوں کے لیے بھی تواتر کے ساتھ لاتعداد کہانیاں اور ایسے ہی دلچسپ مضامین تحریر کیے ہیں جو بچوں کے لیے مخصوص رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے تھے۔ ادب اطفال کے تحت رام لعل کی ساری تحریروں کو یکجا کر کے شائع کرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ اِن میں سے رام لعل کی کچھ نمائندہ تحریریں جو کتابی شکل میں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں وہ یہ ہیں۔ آنے والے کل کے سپاہی-1985، ڈیڈی کی چوری-1985، وادی ماں-1988، اور رام لعل کی دلچسپ کہانیاں-1999۔

کسی بھی ادیب کے ادبی مقام کے تعین کے لیے درج ذیل نکات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

1۔ قارئین میں اُس کی مقبولیت و ہر دلعزیزی۔

2۔ اس کی تخلیقات پر ادب کے معتبر نقادوں و ہم عصروں کے تبصرے، مضامین اور آراء۔

3۔ اس کی تصانیف کی بنیاد پر ادبی دنیا میں اس کے مقام کا تعین۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رام لعل جو نصف صدی سے زائد عرصے تک اردو افسانے کی تخلیق و اشاعت میں سرگرم رہے تھے۔ انھوں نے برصغیر کے قریب قریب تمام ادبی جرائد و مقبول عام رسائل میں بڑی باقاعدگی سے لکھا۔ انھیں اپنے قارئین کی بے پناہ محبت حاصل رہی تھی۔ ان قارئین میں سادہ لوح لوگوں کے علاوہ طالب علم، وکیل، سیشن جج دفتروں کے بابو اور ہزارہا یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور نقاد شامل تھے۔ ان کے ہم عصر ادیبوں کی بڑی تعداد اس کے علاوہ

رہی تھی۔ رام لعل کے پاس ان کی تخلیقات پر اظہار خیال لیے ہوئے ہزار ہا خطوط پہنچتے تھے جن میں سے بیشتر خطوط تو ان کی کتابوں کے ناشرین اس مقصد کے لیے اٹھالے جاتے رہے تھے کہ وہ ان کے ساتھ رام لعل کی تصانیف کے سلسلے میں رابطہ قائم کر سکیں گے۔ لیکن جن خطوط میں ادبی اور علمی مباحث موجود تھے انھیں رام لعل خود یکجا کرتے رہے تھے اور راقم الحروف کے اندازے کے مطابق ایسے خطوط کی ترتیب وتہذیب میں جو کئی جلدوں پر مشتمل ہوگی، اردو کے افسانہ نگار خورشید ملک مصروف کار بھی رہے تھے۔ اس سلسلے میں ایک جلد ''قند مکرر'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا نام قند مکرر اس لیے رکھا گیا تھا کہ اس سے قبل رام لعل خود اپنے نام آئے ہوئے ایسے مشاہیر کے خطوط کا ایک مجموعہ ''حرف شیریں'' کے نام سے پیش کر چکے تھے جواب ہمارے درمیان نہیں رہے تھے۔ یہ مجموعہ 1990 میں شائع ہوا تھا۔ حرف شیریں میں شامل خطوط میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی، تلوک چند محروم، فراق گورکھپوری، راجیند رسنگھ بیدی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس وغیرہ باون (52) ادیبوں کے ایک سوانتیس (129) خطوط شامل ہیں۔ جو خطوط خورشید ملک کی کتاب میں شامل ہیں۔ ان میں آل احمد سرور، سردار جعفری، وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر انور سدید، محمود ہاشمی، جوگیندر پال، سریندر پرکاش وغیرہ سیکڑوں جانے پہچانے اردو ادیبوں کے خطوط شامل ہیں۔ یہ امر بجائے خود اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ رام لعل اپنے ہم عصروں میں جن میں بزرگ ونوجوان سبھی شامل تھے، کتنے مقبول رہے تھے۔ اتنے سارے ادیبوں سے رام لعل کے تعلقات محض سرسری نہیں کہے جاسکتے کیونکہ ان خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے لیے ان کے ہم عصروں، ادیبوں کے دل میں کتنی عقیدت اور کیسا مقام تھا۔ اس سلسلے میں ہم چند ایک ایسے خطوط کے اقتباسات پیش کرنا چاہیں گے جس سے کہ ہمارے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو سکے۔ مثلاً راجندر سنگھ بیدی نے اپنے خط مؤرخہ 26 نومبر 1967 میں لکھا ہے:

> ''آپ کے اسلوب اور سلیقے کی داد دیتا ہوں۔ خاص طور پر کہانیوں میں اس مقام کی جہاں آپ اسے ختم کرتے ہیں۔ بات منتج بھی ہوتی ہے اور نغمے کی طرح فضا میں تھرتھراتی بھی رہتی ہے۔ اس ضمن میں آپ ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں اور مغربی ادب کے

زیادہ قریب ہیں۔''

خواجہ احمد عباس نے 23 اکتوبر 1981 کو شری دشونا تھ پرتاپ سنگھ وزیر اعلیٰ اتر پردیش کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:

''شری رام لعل میرے دوست ہونے کے علاوہ اردو ہندی کے بڑے ادیبوں میں سے ایک ہیں وہ قریباً دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔''

شاعرِ پنجاب تلوک چند محروم اپنے خط مؤرخہ 6 مئی 1960 میں لکھتے ہیں:

''اب جو آپ نے یہ کتاب (نئی دھرتی پرانے گیت) بھیجی تو میاں والی کے کرداروں کی تلاش میں قریب قریب تمام کہانیاں پڑھ لیں۔ ہر کہانی میں اپنے ضلع کی فطرت کا چہرہ نظر آیا۔ آپ نے بڑی غائر نظر پائی ہے۔ طرز بیان میں بھی انفرادیت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اپنی زبان کے الفاظ اور محاورے اردو میں نہایت کاریگری سے کھپاتے ہیں اور بعض مقامات پر خوب شاعری کر جاتے ہیں۔''

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے 27 مئی 1966 کے تحریر کردہ خط میں رام لعل کے افسانوی مجموعے ''چراغوں کا سفر'' سے متعلق لکھا ہے:

''چراغوں کا سفر'' آپ نے تحفتاً دیا تھا اس زمانے میں کاموں کے ہجوم کی وجہ سے پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ ادھر چھٹیوں میں ایک روز کتاب لے کر بیٹھا تو ایک ہی نشست میں سب افسانے پڑھ ڈالے۔ آپ کے فن نے واقعی ترقی کی ہے۔ مجھے اس مجموعے میں جو افسانے خاص طور پر پسند آئے وہ ''سفرِ مسلسل''، ''تمھارا فیصلہ کیا ہے؟'' اور ''تیری گلی میں'' ہیں۔ نفسیاتی تجزیے کی بڑی عمدہ مثال ہیں۔ آپ اس طرح کے موضوع پر ایک ناول لکھ ڈالیں تو بہت اچھا ہو!''

ممتاز ترقی پسند نقاد سید احتشام حسین اپنے 18 اپریل 1964 کے خط میں رام لعل کو لکھتے ہیں:

''آپ نے ٹینسی ولیمز کے ڈرامے کے ترجمے کا مجھ سے
ذکر کیا تھا اور شاید یہ بھی کہا تھا کہ اسے کتابی صورت میں شائع کرنے
کا ارادہ ہے۔ ضرور چھپوایئے۔ اردو میں ڈرامے بہت کم ہیں۔''

ستیش بترا نے اپنے خط مؤرخہ 13 نومبر 1971 میں رام لعل کے ناول ''کہرا اور مسکراہٹ'' کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے:

''میں تمھارے ناول ''کہرا اور مسکراہٹ'' کی بھی ایک
کاپی لے آیا تھا۔ تمھارا ناول میں فوراً ہی پڑھ گیا تھا۔ اچھا لگا۔
تمھارے اسٹائل میں اب ایک دھیمی دھیمی آنچ کا احساس ہوتا ہے۔
جس میں ایک ڈوبے ہوئے غم، کچھ درد اور گہرے احساس کی جھلک
تڑپتی نظر آتی ہے۔ لیکن اس اسٹائل کے ساتھ ہی توجہ ناول کے
موضوع اور کرداروں سے کئی بار ہٹ کر فلسفیانہ (ASIDES) پر
مرکوز ہو جاتی ہے۔ جس سے کبھی کبھی مجموعی تاثر مجروح ہو جاتا ہے۔
اس ناول میں تو یہ سب بہت خوش اسلوبی سے کھپ جاتا ہے۔ کیونکہ
سارا بیان صیغۂ متکلم میں ہے، لیکن دوسری جگہوں پر مصنف کی دخل
اندازی کئی مرتبہ اکھرتی ہے۔ وبھا کا کردار بہت اچھی طرح پیش کیا
ہے۔ لیکن اس کردار کے شروع اور آخر کے حصے میں کچھ مطابقت کی
کمی رہ گئی ہے۔ کسی وقت ملو گے تو (DISCUSS) کریں گے۔
ویسے ناول پسند آیا۔!''

رام لعل نے جن ادبی رسائل و جرائد میں باقاعدگی سے لکھا ان میں پاکستان کے نقوش، اوراق، فنون، ادبِ لطیف، افکار، اقدار، ارتقا، سیپ، تخلیق وغیرہ کے علاوہ ہندوستان کے گفتگو، شب خون، عصری ادب، کتاب، آج کل، نیا دور، تلاش، شاعر کے علاوہ بیسویں صدی و شمع جیسے مقبولِ عام رسائل بھی شامل تھے۔ رام لعل ان ادیبوں میں سے تھے جو انہی رسائل کی بدولت

عام قارئین اور سنجیدہ پڑھنے والوں دونوں میں ہمیشہ مقبول رہے۔

رام لعل کے بارے میں مطبوعہ مضامین کا ایک انتخاب (مرتبہ نریندر ناتھ سوز) ''رام لعل: فن اور شخصیت'' 1985 میں شائع ہوا تھا، اس میں اٹھارہ مشہور و معروف نقادوں کے مضامین ہیں۔ ان میں وارث علوی، جگن ناتھ آزاد، محمود ہاشمی، عابد سہیل، مہدی جعفر، ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر آغا سہیل قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

> ''فکری اعتبار سے رام لعل کا تعلق جدید نثر سے نہیں ہے بلکہ اس نسل سے ہے جس کے جد امجد پریم چند ہیں..... بعض ایسے پہلوؤں سے رام لعل نے اپنا دامن بچایا ہے جو پریم چند کی افسانہ نگاری میں بدرجۂ اتم ملتے ہیں۔ مثلاً ایک تو شاعرانہ اندازِ بیان جس کی ارتقائی اور بھرپور صورت ہمیں کرشن چندر کے یہاں نظر آتی ہے۔ دوسری مکالمہ نگاری جن میں ٹالسٹائے کی فکشن نگاری کی یاد دلاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی رام لعل نے پریم چند کے حدود سے آگے قدم رکھا ہے۔ مثلاً پریم چند پسماندہ طبقے کی عکاسی اور مصوری بڑے فن کارانہ انداز سے کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اونچے متمول طبقے کو اپنی حقیقت نگاری کا جزو بناتے ہیں۔ لیکن مڈل کلاس کے گھروں کی زندگی ان کے قلم کی گرفت میں نہیں آسکی۔ ہمارے سماج کا یہ حصہ بالخصوص مشترکہ ہندو خاندانوں کی طرح طرح کے مسائل سے لبریز زندگی اور خاصی حد تک اسی طرح کے مسلمان گھرانوں کی زندگی فن کارانہ تشکیل کے لیے رام لعل کی منتظر تھی اور رام لعل کی اکثر کہانیاں اس ضمن میں بہت کامیاب فنی تجربے کی حامل ہیں۔ پریم چند کی افسانہ نگاری میں جہاں تک اونچے متمول طبقے کا تعلق ہے وہ اتنا پریم چند کے مشاہدے کا نتیجہ نہیں جتنا پریم چند کے تخیل کا، اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک بڑے فن کار کا تخیل طرح طرح کے فنی جادو جگا سکتا ہے۔ لیکن مشاہدے پر مبنی تجربے کی بات ہی اور ہے۔ یہاں بھی رام

لعل کا مشاہدہ پریم چند کے مشاہدے پر ایک اضافے کا کام کر رہا ہے۔''

مہدی جعفر نے رام لعل کی افسانہ نگاری سے متعلق اپنا تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

''رام لعل کے نام کے ساتھ افسانے کا نام کچھ اس طرح جڑا ہوا ہے جیسے دونوں لازم و ملزوم ہوں۔ انھوں نے افسانے کے کونپل والے دور میں بھی افسانہ نگاری کی ہے اور آج جبکہ افسانہ ایک ہرا بھرا جوان درخت بن چکا ہے۔ اسی لگن سے افسانے کی آبیاری میں منہمک ہیں۔ رام لعل کا کنٹری بیوشن (Contribution) یہ تو ہے کہ انھوں نے ذہین اور مشکل پسند قاری کے لیے علامتی زمین میں چند افسانے تخلیق کیے۔ مگر یہ بھی ہے کہ کہانی کہنے کا ہنر ان میں بدرجۂ اتم موجود رہا اور انھیں عام قارئین کے لیے خاص دلچسپی کا سامان مہیا کرنے پر اکساتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ رام لعل کی دین نہ صرف وقت کے پھیلاؤ پر محیط ہے۔ بلکہ اردو زبان کے پھیلاؤ میں بھی اہم رول ادا کرتی ہے۔ اگر کہانی نہیں مری ہے تو اس میں رام لعل کی ثابت قدمی کو بھی بڑا دخل ہے۔ یہ بذات خود کیا کم کارنامہ ہے کہ رام لعل کے افسانے یکے بعد دیگرے بیک وقت دو یا تین نسلوں کے ساتھ ساتھ قدم ملا کر چلتے رہے ہیں۔''

مہدی جعفر نے اپنے اسی مضمون میں رام لعل کے افسانوں کی امتیازی خصوصیات سے متعلق واضح طور پر یہ بھی لکھا ہے:

''رام لعل کے افسانے حادثات، واقعات اور (Situations) کے ذریعہ زندگی میں پیدا ہونے والی مختلف خلیجوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس طرح کی خلیجیں عموماً ایک خاص کردار کی وساطت سے سامنے آتی ہیں اور وہی سارے افسانے کا

تانا بانا بنتا ہے۔ کردار کی انفرادیت کے پس منظر میں ایک مختلف جہت لیے ہوئے یا تو سماج ہوتا ہے یا کسی دوسرے کردار یا کرداروں کی انفرادیت ابھرتی ہے دراصل رام لعل زندگی میں حائل ہونے والی دراروں یا شگافوں کو کربتا کی کی مختلف جہتوں سے ہی پہچانتے ہیں......" رام لعل کی زبان پختہ ہے۔ ان کا اسلوب روایتی افسانوں کا ہے۔ چنانچہ زبان کے لحاظ سے اکثر غیر محسوس طور پر تراش خراش کرتے نظر آتے ہیں...... مگر زبان کی تراش خراش رام لعل کے فن کا غالب رجحان نہیں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان کی زبان شفاف اور ستھری ہے دو اور دو چار کی طرح دوٹوک ہے۔ شفاف ہونے کی وجہ سے انھیں فائدہ یہ ہوا ہے کہ جس منظر، ماحول یا امیج کو ابھارنا چاہتے ہیں اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ کامیابی اس لیے کہ پڑھنے والا کرداروں یا مناظر کو بعینہ دیکھنے لگتا ہے اور ماحول کو بجنسہ محسوس کرتا ہے۔"

وارث علوی اردو کے فکشن کے ایک بے باک نقاد تھے۔ انھوں نے مغربی زبانوں کے فکشن کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ وارث علوی نے رام لعل کی فکشن نگاری پر ایک طویل مضمون لکھا ہے جس میں وہ رام لعل کو ان کے تمام ہم عصر فکشن نگاروں کے اثر سے بالکل آزاد اور مختار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رام لعل کے افسانوں پر کرشن چندر اور احمد عباس کا بالکل اثر نہیں ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا افسانہ ترقی پسند افسانہ کی مانند نظریاتی تاویل وتصدیق کی طرف پیش قدمی نہیں کرتا۔ ان کے یہاں موضوع کا انتخاب نظریاتی پیش بینی کے تحت نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں مقصدیت اور افادیت پر بھی کوئی اصرار نہیں ملتا۔ اس کا ایک خوش گوار نتیجہ یہ نکلا ہے کہ رام لعل موضوع کے انتخاب میں ترقی پسندوں سے زیادہ آزاد ہیں۔ غیر مشروط ذہن

زندگی کی رنگا رنگی کی تماش بینی کا زیادہ اہل ہوتا ہے۔ اپنی محدود صلاحیتوں پر اگر وہ پابندیاں بھی عائد کرتے تو ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو مہندر ناتھ جیسے معمولی ترقی پسند افسانہ نگاروں کا ہوا۔ یعنی ان کا افسانہ ایک گٹھل، یک آہنگ اور غیر تخیلی سطح سے بلند نہ ہو پاتا۔ افسانہ کو سماجی افادیت یا فوری سیاسی مقاصد کا حلقہ بگوش نہ بنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر وہ واقعہ یا واردات جو انسان اور زندگی کے متعلق معنی خیز بات بتاتی تھی رام لعل کے لیے فن کارانہ دلچسپی کی حامل بنی۔ یہ منٹو اور بیدی اور دنیا کے ہر کشادہ ذہن فن کار کا رویہ تھا۔ یہ بات یاد رکھیے کہ واقعات اور وارداتوں کو فن کار زندگی سے نہیں لیتا، بلکہ زندگی کے حقائق کی ایک نئی ترتیب کے ذریعہ اپنی تخیلی سطح پر ایجاد کرتا ہے۔ فن کار کا ذہن ڈاگما اور ڈاکٹرائن سے جتنا غیر مشروط ہوگا زندگی کے حقائق کی تخیلی ترتیب کے ذریعہ فن کارانہ حقیقت کی تخلیق کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہوگا۔ رام لعل کے افسانوں کا مطالعہ آپ کو بتا دے گا کہ ان میں موضوع، تھیم، محل وقوع، ملیو، کردار اور مواد کی جو رنگا رنگی ہے وہ نتیجہ ہے ذہن کو نظریاتی وابستگی سے بچائے رکھنے کو اور زندگی کو ہر رنگ میں دیکھنے اور قبول کرنے کا۔''

ڈاکٹر سید نثار مصطفیٰ جیسے قلم کار جب رام لعل کی فکر اور فن پر راجیندر سنگھ بیدی کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں تو ہمیں کچھ اختلافِ نظر بھی محسوس ہوتا ہے۔ لیکن ہم ان کی رائے کو یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

''رام لعل کے ہاں بھی چھوٹے چھوٹے واقعات و سانحات میں غیر معمولی رموز پنہاں ہوتے ہیں۔ وہ بھی بیدی ہی کی طرح عمل سے زیادہ حاصلِ عمل پر توجہ مرتکز کرنا اپنا فنی وطیرہ جانتے ہیں۔ ان کے ہاں بہتیری ایسی اعلیٰ درجہ کی کہانیاں ہیں جن پر بیدی کے اندازِ فن کا غالب اثر ہے۔ یہ اثر تقلید محض کا نتیجہ نہیں، اعلیٰ سوجھ

بوجھ اور وقت نظری کا نتیجہ ہے۔ وہ فن میں ایک ادائے خاص اور اپنی شخصیت کے تناظر میں ایک منفرد انداز نظر کے حامل ہیں۔ فنی روایت سے صالح اور مثبت اثر قبول کر کے ایک وضع نو کی تشکیل بھی ایک خلاقانہ سعی ہے۔ چنانچہ طرز سے ایک نیا طرز، ان سے ایک نئی راہ وضع کرنا بذات خود ایک فن کارانہ عمل ہے۔ رام لعل ایسی صفت سے بہرہ مند ہیں۔.....صفحہ 75

رام لعل کا محتاط رویہ سوچ سوچ کر بڑھنا، سنبھل سنبھل کر راہ فن پر قدم رکھنا، جذبات پر قابو پانا، منطق واستدلال کو ملحوظ رکھنا، سیرتوں کے داخل میں اترنا، معاشرتی قدروں کو پیش نظر رکھنا، ادنیٰ کو اعلیٰ بنا کر پیش کرنا اور عمل سے زیادہ نتیجۂ عمل کی جانب متوجہ ہونا وغیرہ وہ اوصاف ہیں جو انھیں بیدی سے قریب کرتے ہیں۔''.....

صفحہ 77 تا 78

رام لعل کی افسانہ نگاری کے متعدد گوشوں پر درجنوں نقادوں نے قلم اٹھایا ہے۔ ان کے بارے میں کئی رسائل نے خصوصی گوشے شائع کیے ہیں جن میں توازن۔ مالیگاؤں، شاعر۔ ممبئی، پرواز ادب۔ پٹیالہ، تخلیق۔ لاہور اور طلوع افکار۔ کراچی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بدایوں کے سہ ماہی جریدہ 'لمحے لمحے' کا رام لعل نمبر بھی ہے۔ ان تمام رسائل و جرائد میں کئی نئے مضامین شامل ہیں جو مذکور بالا کتاب ''رام لعل فن اور شخصیت'' میں شامل نہیں تھے۔ ان تمام مضامین کی روشنی میں رام لعل کی شخصیت اردو افسانے کے آسمان پر ایک درخشاں ستارے کی طرح چمکتی دمکتی دکھائی دیتی ہے۔ بعض نقادوں نے اپنی سہل پسندی کی خاطر 1947 کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں کو کبھی پریم چند کے ساتھ جوڑ دیا، کبھی کرشن چند، بیدی اور منٹو کے ساتھ۔ کسی بھی نسل کے افسانہ نگار میں اس کے پیش روؤں میں سوچ اور عمل میں تھوڑی بہت مماثلت ملنے پر اسے اپنے زمانے سے کاٹ کر پچھلے دور پر چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ ہر تخلیق کار اپنے عصر حاضر کے اثرات زیادہ قبول کرتا ہے۔ اس کے سامنے اقدار کی تبدیلی اور شکست و ریخت کا ایک نیا سلسلہ ہوتا ہے۔ رام لعل نے بھی اپنے دور کے انسانی مسائل کی بھرپور عکاسی کی تھی۔ بے شمار لوگوں کے

رویے پیش کیے تھے۔ جس کا اعتراف کئی نقادوں نے کیا۔ ان پر اعتراضات بھی کیے گئے۔ لیکن مجموعی طور پر انھیں ان کے اپنے عہد کا ہی افسانہ نگار قرار دیا گیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے تاثرات ملاحظہ ہوں:

> ''اردو افسانے میں ایک بڑا نام رام لعل کا ہے۔ انھوں نے کئی دہے میں زندگی کو ملکوں ملکوں گھوم کر جس طرح دیکھا پرکھا ہے اسے افسانے کے قالب میں ڈھالا ہے۔ انسان کے خارج اور باطن میں جو دنیا آباد ہے۔ اس کی سیر کرائی ہے۔ لیکن انفرادیت ہر جگہ برقرار رہی ہے، چاہے ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں ہوں، الجھن اور پیچیدگیوں کے جنگلات ہوں، کشادہ اور ہموار شاہراہیں ہوں، احساسات کا وسیع میدان ہو، آرزوؤں، تمناؤں اور سپنوں کے چاند سورج اور ستارے ہوں، جذبوں کا سمندر ہو، حوصلوں، ارادوں اور توانائی کی نمود ہو، انفرادی آزادی کی امنگ کا منظر نامہ ہو یا تاریخ معاشرہ، انسانی خواہشات، فکر و عمل، خواب گری اور خواب شکنی کے منفی و مثبت مظاہر کی جھلکیاں ہوں، رام لعل اپنی پوری توانائی کے ساتھ ہر موضوع کے امکانات کے پاسدار رہے ہیں۔ اسلوبیاتی تازگی، لفظیاتی حسن و نغمہ اور فنی چابک دستی سے بھرپور ان کا تخلیقی سفر انتہاؤں تک پہنچا ہوا ہے۔''

رام لعل نے ملکوں ملکوں سیر کرنے کے بعد یورپ کی بعض اخلاقیات کو اپنے یہاں کے مشرقی قالب میں ڈھالنا چاہا تو ان کے بارے میں مہدی جعفر نے لکھا:

> ''توجہ کی بات یہ ہے کہ رام لعل نے اپنے افسانوں کے ذریعے بنیادی مشرقی نفسیات کا سوال اٹھایا ہے۔ بنیادی نفسیات جو مشرقی تہذیب کو مغربی تہذیب سے جدا کرتی ہے۔ پھر بھی ایسا نہیں ہے کہ رام لعل نے آفاقی ہونے کا جتن نہ کیا ہو۔ انھوں نے فرانسیسی ناول Acertain smile کے ترجمے کے ذریعے ایک تجربہ کیا تھا

تا کہ دیکھیں کہ وہ خود رام لعل کا ناول ''نیل دھارا'' بن جاتا ہے یا نہیں! وہ رام لعل جو ہندو پاک کی مشرقیت سے رشتہ نہیں توڑتا۔ یہاں تجربے کی ناکامی یا کامیابی اہم نہیں۔ البتہ اہمیت تجربے کی ہے کہ اس سے ہمیں کیا ملا؟ ''نیل دھارا'' میں تمام تر اپنائیت رواں رکھنے کے باوصف ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ''نیل دھارا'' کی آرتی اپنی بنیادی فطرت میں مغربی ہی رہتی ہے۔ ''ایک شہری پاکستان کا'' کی سرسوتی کی بنیادی فطرت نہیں بدل پاتی۔ سرسوتی جذباتی طور پر دو نیم حالت میں ہے اور اس کی مامتا کا پلا پہلے گمشدہ شوہر بلدیو کے تئیں اتنا جھکتا ہے جتنا موجودہ شوہر سریندر کے لیے۔ مگر آخر کار سریندر کے حق میں فیصلہ شاید اس زائد ممتا کے باعث ہے جسے افسانے کے آغاز میں بخوبی ابھار دیا گیا ہے۔ رام لعل کے افسانوں میں عموماً متوسط طبقہ ہے جو ایک طرح سے دریائے شہر کا منجدھار ہے رام لعل کی زبان میں جو ایک قصباتی رنگ ہے وہ اس طبقے کے ذیل میں معاون ثابت ہوتا ہے۔''

پاکستان کے ایک ترقی پسند ادیب پروفیسر محمد علی صدیقی نے رام لعل کے افسانہ نگاری کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے، اسے بھی نظر انداز کرنا مشکل ہوگا۔ محمد علی صدیقی نے یہ مضمون اردو کے کسی رسالے اور جریدے میں نہیں بلکہ پاکستان کے سب سے زیادہ مشہور و مقبول انگریزی اخبار 'ڈان' کے لیے قلم بند کیا تھا:

''رام لعل کی افسانہ نگاری کوئی چالیس سال سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ اس نے اپنی فکشن کے لیے حقیقت پسندی اور علامت نگاری دونوں سے کام لیا ہے۔ لیکن اس کے اب تک کے طویل ادبی کیریئر میں اس نے زیادہ تر توجہ انسانی رشتوں کی بھرپور عکاسی کرنے میں صرف کی ہے۔ وہ سماجی روایات میں بتدریج ہونے والی تبدیلیوں کے سبب خاصی کشیدگی اور کشمکش میں مبتلا رہے

ہیں۔رام لعل کا تعلق آزادی کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں کی نسل سے ہے۔اس کے لیے آزادی ایک ایسی نعمت کا درجہ رکھتی ہے جس کا سودا کسی دیگر شے کے ساتھ نہیں کر سکے۔ان کے لیے حکمراں طبقے کے ان رویوں کے ساتھ بھی جن پر تشدد کا رجحان غالب ہے سمجھوتہ کرنا ناممکن بنا رہا ہے۔''

رام لعل کی تصانیف کی بڑی تعداد افسانوی مجموعوں پر مشتمل ہے۔ان کی دیگر تصانیف میں ناول، سفرنامے، انتخابات، تاریخ اور بچوں کے لیے لکھی گئی متعدد کتابیں شامل۔ان کی ایک خودنوشت سوانح بھی ہے۔ان کے مطبوعات کے علاوہ ان کی پچاس سال کی ادبی ڈائری بھی ہے۔ جسے ہُما جمال رضوی نے مرتب کر کے ''رام لعل کے شب و روز'' عنوان سے 1996 میں شائع کیا تھا۔اتنی زیادہ تصانیف کے مصنف کے بارے میں جبکہ ان کے ایک سو کے قریب افسانے ان کے تاحال مطبوعہ مجموعوں میں شامل نہیں کیے گئے لیکن وہ مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ نہ صرف زرخیز ذہن کے مالک تھے بلکہ بڑی حد تک بسیار نویس بھی واقع ہوئے تھے۔بسیار نویس یا زود نویس ہونا قابلِ تعریف بھی ہوسکتا ہے اور نہیں بھی۔کوئی ایسا ادیب اگر مقدار اور معیار کے درمیان توازن برقرار رکھ سکے تب تو اس کی تعریف ہی کی جائے گی، لیکن اگر اس کے قلم سے نکلی ہوئی زیادہ تر تخلیقات محض بھرتی کی ثابت ہوں گی تو اس سے اس ادیب کی اپنی شبیہ خراب ہوگی۔رام لعل پر یہ الزام کئی نقادوں، دیباچہ نگاروں اور مبصروں نے اکثر لگایا ہے کہ انھوں نے بہت زیادہ لکھا اور بے تکان لکھا۔ان کے ایسے معترضین میں وارث علوی، گیان چند جین، نسیم کنجاہی، قمر رئیس اور پروفیسر صادق وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔لیکن انہی لوگوں نے رام لعل کے خلاقانہ ذہن کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا ہے اور ان کی کئی تخلیقات کو اردو کا بیش بہا سرمایہ کہا ہے۔

زود نویسی دراصل کسی بھی ادیب کے لیے اس کے خاص دور کا رویہ ہوتا ہے۔وہ اتنا کچھ مطالعہ کر چکا ہوتا ہے اور اتنا کچھ زندگی کا مشاہدہ کر چکا ہوتا ہے کہ اس کا جی چاہتا ہے کہ زندگی کے ہر پہلو پر ایک افسانہ تحریر کر دے۔یہ کیفیت شاعروں کے ساتھ بھی ہوتی ہے۔بیشتر شاعر ہر دوسرے تیسرے روز ایک نئی غزل تیار کر لیتے ہیں۔لیکن ان پر بھی یہ الزام تو عائد ہوتا ہی ہے کہ ان

کے یہاں اچھے اشعار کی کمی یا اچھے اشعار کے انتخاب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس سے ان کے ادبی مرتبے میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ میر، اقبال، جوش، فراق، جگر، فیض سب اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ان کے بعد بھی کتنے ایسے شعراء ہیں جن کی تخلیقات کے معیاری یا افادی ہونے کے فیصلے ابھی کیے جانے باقی ہیں۔

اردو فکشن میں پریم چند، کرشن چند، سعادت حسن منٹو، رام لعل، جوگیندر پال، قرۃ العین حیدر، وغیرہ ایسے اور بھی کئی افسانہ نگار ہیں۔ جن کے افسانوں کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ انھوں نے ناول بھی لکھے اور ان کے علاوہ دیگر اصناف ادب میں بھی طبع آزمائی کی۔ سوال اپنی جگہ یہ برقرار رہتا ہے کہ ان سب کے یہاں کتنا کچھ اچھا ہے اور کتنا کچھ معمولی۔ زیادہ لکھنے کی وجہ سے اس بات کا امکان یقینا رہتا ہے کہ عجلت کی وجہ سے بعض ایسی تحریریں بھی معرض وجود میں آجاتی ہیں جو اس مصنف کے اپنے قائم کردہ معیار سے کم تر قرار پاتی ہیں لیکن جو لوگ بہت ہی کم نویس واقع ہوتے ہیں، ان کے یہاں بھی ایک سے معیار کی کیا گارنٹی ہوسکتی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کون سا تخلیقی لمحہ ادیب کو اپنی گرفت میں لے کر اس سے ایک اعلیٰ درجہ کا فن پارہ لکھوالیتا ہے۔ ایسی تخلیق جو آورد کی محتاج ہوتی ہے۔ اس کا بھی مطالبہ ہوتا ہے کہ اس کی مناسب قطع و برید کی جائے، اس پر محنت کر کے اسے کسی ہیرے کی طرح تراش کر ہیرے جواہرات کے پارکھیوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اردو کے معروف ترقی پسند نقاد پروفیسر قمر رئیس فرماتے ہیں:

> ''یہ بات اگر تہذیب نہیں تو آداب ہنرداری کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ آدمی مسلسل تا حیات لکھتا ہی رہے۔ رام لعل کے بارے میں بارہا دل میں یہ خیال سوال بن کر آیا کہ وہ آخر اتنی طویل مدت (45 سال) سے لگاتار کیوں لکھ رہے ہیں؟ کیا کوئی ایسی تحریک یا قوت نہیں تھی جو انھیں اس طرح بے تکان اور مسلسل لکھنے سے باز رکھ سکتی، جبکہ کرشن چندر کی طرح انھوں نے افسانہ نگاری کو روزی کا ذریعہ بھی نہیں بنایا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچا کہ رام لعل، کرشن چندر کے برعکس ہر سال چند کہانیاں ایسی ضرور دے جاتے ہیں۔ جو ان کے پچھلے دور کی اچھی کہانیوں سے اچھی ہوتی ہیں۔ گویا

ان کے فن کا ارتقاء کا نہیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رہی اور عوامی مقبولیت کے ساتھ ساتھ وہ اہل نظر کی توجہ اور تحسین سے بھی محروم نہیں رہے۔ رام لعل میرے دیرینہ دوست ہیں۔ ایک بار ملنے آئے تو میں نے اپنی یہ پریشانی ان سے کہی۔ اپنی مخصوص معصومیت سے بولے۔ یہ تمھارے سوچنے کی بات ہے، میرا کام تو لکھنا ہے، تو اس کے بعد ان کی کہانیوں کے نئے مجموعے میں زیادہ توجہ سے پڑھتا رہا۔ پتہ یہ چلا کہ رام لعل انسانی مقدر اور انسانی قدروں کی شکست و ریخت کے بارے میں بعض دوسرے فن کاروں کی طرح قسطوں میں نہیں سوچتے بلکہ یہ تشویش و تردد لگاتار ان کی جان کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ پھر یہ بھی ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ آدمی اگر سفر میں رہے۔ (اور وہ بھی ریل کے سفر میں جب سارا بدن رقص کرتا ہے) تو بقول اختر انصاری ذہن خاص کر تخلیقی ذہن بڑی سرعت سے کام کرنے لگتا ہے۔ پھر رام لعل کے ساتھ یہ ہوا کہ ہجرتوں اور مسافرت سے ان کے تجربات کے دائرے اور تخلیقی منظرنامے ہمیشہ بدلتے رہے اور انھیں سوچنے پر اکساتے رہے۔ یہ بھی ہوا کہ ان منظروں کی بے رنگی سے اکتا کر وہ کبھی کبھی اپنے بچپن کے حسین گہواروں اور یادوں کی پراسرار حویلیوں میں ہجرت کرتے رہے (آنگن، قبر جیسی کہانیاں) اس لیے ہمیشہ ان کے پاس کہنے کو کچھ رہا اور عمر کے ساتھ ساتھ کہنے کی باتوں میں بھی تہہ داری اور گہرائی آتی گئی۔ ترقی پسند تحریک اور فکر سے ان کی ذہنی مناسبت اور قربت نے ہر مسئلے کو اس کے تاریخی تناظر میں سمجھنے کی قدرت دی۔ بس ایک مشکل یہ تھی کہ وہ کرشن چندر، بیدی اور منٹو تینوں سے یکساں طور پر متاثر تھے اور ایک مدت تک اپنے منفرد اسلوب فن کی تعمیر سے محروم رہے۔ اپنے فن کی انفرادی شناخت قائم کر لینا اتنی بڑی بات یا اتنے فخر کی بات نہیں ہے

جتنی کہ ہمارے یہاں سمجھی جاتی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ فن کار نے اپنے عہد کی حقیقتوں کو کیسے خلوص، دردمندی اور شدت کے ساتھ سمجھا اور محسوس کیا اور فن کے قالب میں اُنھیں کیسی بے باکی، دلکشی اور قوت سے پیش کیا ہے۔ اس معاملے میں رام لعل کا قد اپنے بہت سے معاصرین سے نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ تقسیم اور ہجرت کے ہمہ گیر اثرات، فیوڈل اقدار کی جانکنی، نئے سماجی رشتوں کا طلوع اور ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے پیچیدہ مسائل رام لعل کی کہانیوں میں ان حقائق کو پیش کرنے کا انداز سیدھا سادا لیکن مؤثر اور دلکش ہے۔ انھوں نے بیانیہ کی قوت کو طرح طرح سے آزمایا ہے۔ خاص کر اس کے ڈرامائی اثرات سے ماہرانہ طور پر کام لیا ہے۔ وہ کسی بھی واقعے کی تفصیلات کو جذباتی آویزش کے مؤثر اظہار کا پس منظر بنا دیتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی لگ بھگ ایک تہائی کہانیاں اور کامیاب کہانیاں واحد متکلم کے انداز میں ہیں۔ یہاں واحد متکلم ایک معتبر کردار کی حیثیت سے ابھرتا ہے اور اس کے تجربے اور مشاہدہ کے لمس سے ہر واقعہ قاری کے لیے زیادہ باوثوق (Authentic) ہو جاتا ہے۔ جس سے کہانی کی معنوی وحدت کی تعمیر میں آسانی ہوتی ہے (مثلاً اکھڑے ہوئے لوگ، ہیڈلیس بُدھا، لورز، آخری خواہش، ریسٹ ہاؤس وغیرہ) بیدی کی طرح رام لعل بھی بچوں کی نفسیات اور عوامی روایتوں اور گیتوں سے بڑا کام لیتے ہیں۔ ''نئی دھرتی پرانے گیت'' میں یہ بات کہ عوامی گیت انسان کی تخلیقی محنت، اتحادِ عمل، اس کے بلند حوصلوں اور آرزوؤں کا رزمیہ اظہار اور روحانی نغمے ہوتے ہیں۔ رام لعل نے جس تاثر آفریں ڈھنگ سے کہی ہے۔ وہ کسی علمی مقالے میں نہیں کہی جا سکتی تھی۔ در اصل رام لعل کی کہانیاں ان کی عوام دوستی اور انسان دوستی، دونوں کی

بڑی شفاف، رچی ہوئی اور تابناک تصویریں ہیں۔ انھوں نے شب خونی جدیدیت کے نیم رومانی سیلاب میں حقیقت نگاری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا بلکہ اشاراتی اظہار سے کام لے کر حقیقت نگاری کو فن کی عصری ضرورتوں سے ہم آہنگ بنایا اور عام قارئین سے کہانی کا رشتہ استوار رکھا۔ 'چاپ' اور 'آنگن' جیسی کہانیاں اس کی روشن مثالیں ہیں۔ رام لعل کا فن اردو افسانے کی بنیادی روایت کی تعبیر اور توسیع دونوں سے عبارت ہے۔''

وارث علوی رام لعل کے افسانوی فن کا اپنے مضمون ''رام لعل کی افسانہ نگاری'' میں جو کم و بیش اکتیس صفحات پر محیط ہے۔ جائزہ کا آغاز ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:

''رام لعل لکھتے ہیں: ''آج میں اپنے آپ کو اردو کے افسانے کی دونسلوں کے درمیان پھنسا ہوا پاتا ہوں۔'' میرا خیال ہے رام لعل پھنسے ہوئے کم ہیں اور سنڈوچ زیادہ ہیں۔...... ٹماٹر کے قتلے کی مانند وہ دونوں نسلوں کے بیچ لیٹے ایک عجیب خود اطمینانی خود اعتمادی اور آہستگی سے اپنا کام کیے جاتے ہیں اور یہ کام ہے کہانیاں کہنا۔ وہ بنیادی طور پر کہانی کار (Tellers of tales) ہیں۔ انھیں کہانیاں لکھنا آتا ہے۔ وہ ہر موضوع، واقعہ اور تھیم کو کہانی میں ڈھال سکتے ہیں اور یہی ان کی طاقت اور یہی ان کی کمزوری ہے۔ موپاساں، چیخف، پریم چند منٹو اور بیدی کی مانند وہ بے شمار کہانیاں سوچ سکتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے محل وقوع، ملیو، کردار اور پلاٹ کا زبردست تنوع ہے۔ ان کی ہر کہانی دوسری سے مختلف ہے اور اسی لیے وہ نئے لکھنے والوں کی ایک آہنگی اور یک رنگی کا شکار نہیں۔''

اسی مضمون میں وارث علوی نے رام لعل کے بارے میں اپنے مخصوص انداز سے لکھا ہے کہ رام لعل کو دنیا کی کوئی طاقت برے افسانے لکھنے سے نہیں روک سکتی۔ وہی وارث علوی اسی مضمون میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اگر رام لعل کی تمام تر افسانہ نگاری ایسی کمزوریوں اور
نقائص کی حامل ہوتی جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے تو میں ان پر یہ
مضمون نہیں لکھتا اور انھیں ایک معمولی تفریح پسند یا مقبول عام افسانہ
نگار سمجھ کر یکسر نظر انداز کر دیتا۔ لیکن رام لعل نے بعض بہت اچھی
کہانیاں لکھی ہیں جن پر اردو افسانہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔''

وارث علوی کے ''مخصوص'' انداز کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں:

''وارث کا جو ایک انداز ہے اس انداز سے جب وہ ہٹ
جاتے ہیں تو مضمون وہ نہیں لکھ سکتے۔ جب تک کہ وہ تمسخر اور استہزا
اور غصہ اور تھوڑا جسے کہنا چاہیے کہ تھوڑا الفنگا پن نہ ہو۔''

ہم سمجھتے ہیں کہ رام لعل نے اردو کو جو بے شمار افسانے دیے ہیں جن میں سے بعض یقیناً کمزور ہیں لیکن اگر دیانت دارانہ انداز سے دیکھا جائے تو انھوں نے ہر سال ایک اعلیٰ درجہ کا افسانہ ضرور لکھا ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں ان کے ایسے پچاس افسانوں کا سختی سے انتخاب کیا جائے تو ایک درجن ایسے افسانے یقیناً مل جاتے ہیں جنھیں ہم اردو افسانے کی آبرو کہہ کر بڑے فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اکھڑے ہوئے لوگ، نئی دھرتی پرانے گیت، ایک شہری پاکستان کا، او۔سی، قبر، لورز، کنکھجورا، ٹیلے، چاپ وغیرہ۔ جس طرح پریم چند، ڈپٹی نذیر احمد، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم کے بعد کرشن چندر، راجیندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے اردو افسانے کی افق اور فکر میں قابل قدر اضافے کیے، ان کے بعد آنے والے افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر، شوکت صدیقی، انتظار حسین، اقبال متین، غیاث احمد گدی، غلام الثقلین نقوی، جوگیندر پال کے گروہ میں رام لعل کا نام کئی لحاظ سے نمایاں اور قابل قدر ہے۔ ان کے موضوعات میں جو تنوع ہے، اس کا اعتراف اردو کے کئی نقادوں نے کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ افسانے کے فن پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے اور ان کے اسلوب میں نہ صرف پختگی ہے بلکہ ایک انوکھی شان بھی ہے جو رام لعل کی اپنی پہچان بن چکی ہے۔

رام لعل کی منتخب کہانیاں

ایک ہزار بچوں والی ماں

گلی کے موڑ پر جو چھوٹا سا میدان ہے اس کے دو طرف پکے مکان بنے ہوئے ہیں، تیسری طرف ایک مکان کی عقبی دیوار ہے اور اسی کے سایے میں تین چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ سرکنڈوں اور سوکھی گھاس کی۔ ایک جھونپڑی میں ساٹھ سال کی بوڑھی بختاں رہتی ہے اپنی دو کنواری بیٹیوں کے ساتھ۔ بڑی بیٹی جس کا نام خیری ہے اپنی دادی کی طرح لمبی ہے۔ چھوٹی کا نام کینی ہے وہ سانولی ہونے کے علاوہ چھوٹے قد کی بھی ہے۔ کہتے ہیں وہ اپنے باپ پر گئی ہے جو ایسا ہی سانولا اور پستہ قد تھا۔ اسے مرے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں۔ دوسری جھونپڑی میں بختاں کا بیٹا غلام حسین اور اس کی بیوی مریم اور میری عمر کا ایک بیٹا قادر رہتے ہیں۔ غلام حسین رات کو بازار میں چوکیداری کرتا ہے اور دن میں اپنے چھوٹے سے کھیت میں جا کر ہل چلاتا ہے، تیسری جھونپڑی میں اس کے دونوں بیل باندھے جاتے ہیں۔

مجھے یاد ہے اسی میدان میں ایک بار ان کا بیل اچانک بھڑک اٹھا تھا اور جب وہ کسی طرح قابو میں نہ آ سکا تو غلام حسین نے غصے میں بھر کر اس کے پیٹ میں اپنا نیزہ بھونک دیا تھا۔ پھر محکمہ انسدادِ بے رحمی جانوراں سے ڈر کر اس نے اپنی پگڑی اتار کر بیل کے زخم پر باندھ دی تھی اور اسے جانوروں کے اسپتال میں لے گیا تھا۔

اس میدان کے ساتھ میرے بچپن کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ یہیں میں نے پہلے

پہل سائیکل چلانا سیکھا تھا اور کئی بار منہ کے بل گرا تھا۔ اسی میں ہم گلی ڈنڈا اور ہاکی کھیلا کرتے تھے اور کئی بار بختاں کے پانی کے گھڑے پھوڑ ڈالے تھے۔ اسی میدان میں ہم لڑکے لوگ کبوتروں کو پھانسنے کے لیے ایک ٹوکرے کو اوندھا کر کے ایک ڈنڈے کے سہارے کھڑا کر دیتے تھے اور اس کے نیچے باجرہ بکھیر کر اور ڈنڈے کے ساتھ بندھی ہوئی لمبی ڈور کا سرا پکڑ کر دور گروپ بنا کر بیٹھ جاتے تھے۔ جب کوئی کبوتر پھنس جاتا تو وہ مارا کہہ کر دبوچ لیتے تھے۔ کبوتر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں، پھر تیسرے ہاتھ میں اور کئی ہاتھوں میں سے ہوتا ہوا بالآخر بوڑھی بختاں کے ہاتھوں میں جا پہنچتا تھا جو اسے کھلی فضا میں چھوڑ کر ہمیں سمجھانے لگتی تھی۔ ''آزاد پنچھیوں کو قید کر لینا گناہ ہوتا ہے۔ انھیں اڑنے دو۔''

ہمارے اس کھیل میں یقیناً اس کا پوتا قادر بھی شامل رہتا تھا جو عموماً صرف کرتا ہی لپیٹے ہوتا اور جب وہ ہمارے ساتھ کبوتر کی گھات میں بیٹھا ہوتا تو آگے سے ہمیشہ ننگا ہو جاتا تھا۔ ہم اسے ننگا ہو جانے پر چھیڑتے تو بختاں کی دونوں بیٹیاں دور کھڑی منہ میں اپنے دوپٹوں کے پلو ٹھونسے ہنسی کو روکنے کی ناکام کوشش کیا کرتی تھیں۔

میں آنکھیں بند کیے لیٹا لیٹا اسی میدان کے سامنے ایک چھوٹے سے گوردوارے کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ ایک لمبے چولے اور ننگی ٹانگوں والا گرنتھی ارداس ختم کر کے ہاتھ میں ایک بڑی سی تھالی اٹھائے ہوئے باہر آ جاتا ہے۔ گرم گرم بھاپ دیتا ہوا کڑاہ پرشاد پانے کی خوشی میں ہم سارے لڑکے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ شور بھی مچاتے ہیں اور دونوں الگ الگ ہاتھوں میں پرشاد لینے کے لیے اسے دھوکا بھی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ بھیڑ میں اسے ہاتھوں کی تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن جب وہ کسی کو پکڑ لیتا ہے تو اسے صرف اتنی تنبیہ کر کے معاف کر دیتا ہے کہ وہ اس کے پاس گورمکھی پڑھنے کے لیے ضرور آ جایا کرے۔ پرشاد پانے کی لالچ میں میں نے بہت بار گورمکھی پڑھنے کی کوشش کی مگر اوڑا آیا ککا گھگھا سے کبھی آگے نہ بڑھ سکا۔

ایک بار میں دونوں ہاتھوں میں پرشاد لیے باہر نکلا تو دروازے پر بختاں کو کھڑے ہوئے دیکھ لیا جو قادر کو ڈھونڈنے آ گئی تھی۔ قادر ایک طرف بھیڑ کے پیچھے کھڑا جلدی جلدی کڑاہ پرشاد نگل رہا تھا اور وہ دادی کو دیکھتے ہی جلدی سے کھسک گیا۔ میں نے بختاں کا دھیان بٹانے کے لیے اپنا پرشاد اس کے ہاتھوں میں دے دیا اور کہا..... ''اماں تمھیں بھی پرشاد چاہیے؟ یہ میرا حصہ

ہے اُسے کھانا مت، یہیں رکو۔''

اور پھر گرنتھی کو پکڑ کر اس کے پاس لے آیا..... ''سردار جی انھیں بھی پرشاد دو نا! یہ ہماری اماں ہے۔''

گرنتھی اسے جانتا تھا۔ وہ خود ہی اسے اماں کہہ کر بلاتا تھا۔ اس نے بختاں کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا..... ''تمھارے پاس تو پرشاد ہے اماں! کہاں سے پا گئیں!''

یہ سن کر میں نے جھپٹ کر اپنا حصہ اماں کے ہاتھوں سے اٹھا لیا اور گرنتھی نے اس کے حصے سے اس کے دونوں ہاتھ لبالب بھر دیے اور وہ ہم سب کو اللہ کی برکتیں نازل ہونے کی دعائیں دیتی ہوئی میدان کی طرف لوٹ گئی۔

سر کے نیچے کتنی دیر سے اٹیچی رکھے رکھے کھوپڑی میں ایک ٹیس سی اٹھنے لگی ہے۔ گاڑی کا شور بھی میرے دماغ میں بھر گیا ہے۔ میں کروٹ بدل کر پھر آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اور دادی سے پوچھنے لگتا ہوں..... ''اماں،..... وہ بختاں اتنی اچھی کیوں لگتی ہے مجھے؟ بالکل تمھاری طرح!''

دادی مجھے اپنے سینے کے ساتھ لگائے ہوئے جواب دیتی ہے..... ''بے شرما، اسے نام سے کیوں پکارتا ہے؟ وہ بھی تو تیری اماں ہے!''

''ہے تو۔ میں جانتا ہوں پر وہ اتنی اچھی کیوں لگتی ہے۔ بس یہی جی چاہتا ہے دن میں دو ایک بار اسے دیکھنے میدان میں ضرور جایا کروں۔''

''دیکھ وے! وہ تجھے اس لیے اچھی لگتی ہے کہ وہی تجھے اس دنیا میں لے آئی تھی۔ اور تیرے باپ اور تیرے دونوں چاچوں اور تیری پانچوں پھوپھیوں کو بھی۔ میں کہتی ہوں ہمارے پریوار کے سب چھوٹے بڑے بچے اسی کے ہاتھوں جنوائے ہوئے ہیں۔''

بچے کی پیدائش کا جو تصور بچپن میں میرے ذہن میں موجود تھا۔ وہ اب بھی کسی طرح ٹوٹتا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ اور میں ایک عجیب سی حیرت سے خلا میں گھورتا ہوا ایک اونچے قد کی روئی کے گالوں جیسے بالوں والی بڑھیا کو آسمان کی اور ہاتھ اٹھائے ہوئے دیکھنے لگتا ہوں جو ہاتھ بڑھا بڑھا کر دھند کے پہاڑ میں سے ایک بچہ لے لیتی ہے اور پھر پلٹ کر اس کی ماں کی گود میں ڈال دیتی ہے۔ اور یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا۔

''اماں، اماں، وہ پھر کب بچہ جنوانے آئے گی؟ میں اس کے پاس کھڑا ہو کر

دیکھوں گا۔''

''ہشت! رہا نا بے شرم کا بے شرم! پر اب تو تیرا چاچا اسے گھر کے اندر قدم بھی نہیں دھرنے دیتا۔ پڑھ لکھ کر نئی روشنی کا ہو گیا ہے نا! کہتا ہے اس کے ناخنوں کے اندر میل بھرا رہتا ہے اور اس کی آنکھوں میں گندگی بھی لگی رہتی ہے۔ خیر اب تو بچاری کی بہو مریم نے ہی یہ دھندا سنبھال لیا ہے۔''

مجھے یاد ہے جب میری چاچی مری تھی تو رونے والوں میں بخاں بھی آ کے بیٹھ گئی تھی۔ پہلے تو منہ پر کپڑا رکھ کر اکیلی بیٹھی آنسو بہاتی رہی تھی۔ پھر میری دادی کے پاس کھسک کر رو رو کر کہتی رہی تھی..... اب مارنا جلانا تو پروردگار کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ اس محلے میں جتنی عورتیں مری ہیں انھیں میں نے تھوڑے ہی مارا ہے! میرے اختیار میں ہوتا تو کسی کو اوپر جانے ہی نہ دیتی۔!''

چھٹیوں میں گھر آنے کے پہلے ہی روز میں اسی میدان کی طرف چلا گیا تھا۔ اگر چہ اب میرا بچپن کا کوئی ہمجولی وہاں موجود نہیں تھا۔ میری طرح سب بڑے ہو کر ادھر ادھر تعلیم و تربیت اور معاشی جدوجہد میں سما گئے تھے۔ بخاں کا پوتا قادر تک فوج میں بھرتی ہو کر کسی دور کی چھاؤنی میں جا کر رہنے لگا تھا۔ مجھے دیکھ کر بخاں کا جھرّیوں سے بھرا ہوا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا تھا۔ اس نے کہا..... پتر، اب تو لاہور میں پڑھتا ہے نا۔ بہت بڑا اضلع افسر بن کر دکھانا! میں میاں ذکری کے مزار پر تیرے لیے منت مانگوں گی۔''

اس کی دعاؤں سے متاثر ہو کر میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک ہی سکہ ہاتھ لگا اور اس کی مٹھی میں دے دیا جسے محسوس کر کے وہ خوش ہو کر بولی..... ''اللہ تیری کمائی میں برکت دے۔ پر یہ تو پوری چونّی ہے۔ اتنی ساری مجھے کیوں دے رہا ہے؟''

''اب رکھ بھی لے اماں! یہ اتنی ساری کہاں ہے!''

''ارے واہ! اس کی تو آدھی بھیلی گڑ کی آ جائے گی۔ میں ابھی جا کر لے آؤں گی۔''

جس حساب سے اس نے چونّی کی اقتصادیات کا اندازہ لگایا تھا اسی طرح میں بھی من ہی من میں سوچنے لگا..... اماں سچ کہتی ہے۔ اسی چونّی سے میں اسٹیشن سے اپنے گھر تک تانگے پر آٹھ بار آ جا سکتا ہوں اور انگریزی نہانے والے صابن کی دو ٹکیاں خرید سکتا ہوں یا ایک فاؤنٹن پن بھی لے سکتا ہوں یا ہاکی کا ایک بال یا دو پیسے فی لفافہ کے حساب سے اپنی دل پسند لڑکی کو آٹھ خط

بھی پوسٹ کرسکتا ہوں۔!

''کیا سوچ رہا ہے پتر!''

''اماں میں یہ سوچ رہا ہوں تمھارے اگر سارے بچے تمھیں ایک ایک چونی لا کر دے دیں تو تم نہ صرف اس میدان کو خرید سکتی ہو بلکہ اس کے اوپر ایک محل بھی تعمیر کر سکتی ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو!''

''ارے تو تو بالکل شیخ چلی جیسی باتیں کرتا ہے! میرے بچے اپنے اپنے محلوں میں آباد رہیں مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی۔ میں مر بھی جاؤں گی تب بھی سکون محسوس کرتی رہوں گی کہ اپنے پیچھے ایک آباد اور شاد خاندان چھوڑ آئی!''

میں بڑی بے چینی سے اپنی کیو میں دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا کسٹم آفیسر تک پہنچتا ہوں۔ اس کے اشارے پر اٹیچی اس کے سامنے کھول دیتا ہوں۔ وہ کپڑوں کے درمیان سے ایک نئی گرم شال کھینچ کر پوچھتا ہے...... ''یہ کیا ہے؟ کس کے لیے ہے؟''

میں کش مکش میں پڑ جاتا ہوں۔ پہلے اس کا نام بتاتا ہوں جس کے لیے شال لے جا رہا ہوں۔ پھر اس کی عمر کا حساب بتانے لگتا ہوں کہ وہ کس قدر عظیم ہے...... چالیس سال پہلے اسے دیکھا تھا تو اس وقت وہ ساٹھ سال کی تھی۔ اس بیچ میں کچھ برسوں کے حساب کی گڑبڑ بھی ہے۔ اندازاً دس سال اور جوڑ لوں تو وہ ایک سو دس سال کی تو ضرور ہو چکی ہوگی اور جب میں اپنے ہاتھوں سے اس کو یہ شال اوڑھاؤں گا تو وہ کس قدر خوش ہو اٹھے گی! مجھے بے شمار دعائیں دے گی۔ بار بار میرا سر چومے گی...... انسپکٹر صاحب! وہ میری ماں ہے۔''

ہاں ہاں وہ تمھاری ماں ضرور ہوگی پر تمھیں یقین ہے کہ وہ اب تک زندہ ہوگی بھی یا مر کھپ چکی ہوگی!''

وہ ہنسنے لگتا ہے اور مجھے اس کے بار بار کھلتے اور بند ہوتے ہوتے منہ کو دیکھ کر ایک اندھیری قبر کا خیال آجاتا ہے۔ ایک سنسان قبرستان کے اندر بے شمار دھنسی ہوئی اور نئی نئی قبروں کے درمیان اور میں فیصلہ کر لیتا ہوں...... ٹھیک ہے میں اسے وہاں بھی تلاش کرلوں گا اور اسے ایک بار یہ اوڑھاؤں گا ضرور!

ایک شہر ایک بدن

دس دسمبر کو پرنسپل بھوٹانی اور اس کی بیوی شوبھا کی شادی کی چالیسویں سالگرہ تھی۔ میں ان کے فلیٹ پر پہنچا تو وہاں کسی قسم کی بھیڑ بھاڑ نہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ باہر صرف انہی کی کریم کلر کی فیٹ موجود تھی جبکہ ایسے موقع پر کئی کاریں اور اسکوٹر نظر آنے چاہئیں تھے۔ بھوٹانی اپنے اسٹڈی روم میں اکیلا بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ وہ رم ہی پینے کا عادی تھا، اور اس وقت بھی اس کے سامنے رم کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ شوبھا بھوٹانی کچن میں تھی جس کی ایک جھلک میں نے اسٹڈی روم میں جاتے ہوئے دیکھ لی تھی۔ ادھیڑ اور دبلی پتلی سی عورت اس گھر کی تنہائی سے میں پہلے سے واقف تھا۔ ان کے سارے لڑکے اور لڑکیاں مدت ہوئی شادی بیاہ کر کے مختلف شہروں اور مختلف ملکوں میں رہ رہے تھے لیکن شادی کی سالگرہ کے دن وہاں بھی سناٹا دیکھ کر مجھے خیال گزرا شاید آج کی دعوت ملتوی کر دی گئی ہے۔ میں نے بھوٹانی سے اس قدر خاموشی کا سبب پوچھا تو وہ الماری سے میرے لیے وہسکی نکال کر لاتے ہوئے بولا۔ ''آج کے دن میں صرف ایک دوست کو انوائیٹ کر لیتا ہوں یہ میرا برسوں کا دستور ہے۔ اتفاق سے آج تمہاری باری آ گئی ہے۔''

پھر وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور ہنسی کے ساتھ اس کا تھل تھل بھاری شریر بھی ہلنے لگا۔ ''لیکن یار، آج میں یہ دن ایک ایسی محبوبہ کی یاد میں منا رہا ہوں جس سے اب میں قطع تعلق کر چکا ہوں۔''

میں اس سے عمر میں بیس سال کے قریب چھوٹا تھا، پھر بھی وہ بڑی بے تکلفی سے مجھے یار کہہ کر مخاطب کرلیا کرتا تھا جس سے اس کے اندر ہمیشہ جوان رہنے کی خواہش کا احساس ہوتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ایک تعلیمی ادارے کا ذمہ دار فرد ہوتے ہوئے بھی بے حد خوش باش اور اوباش واقع ہوا تھا لیکن اس کے معاشقوں کے قصے سوائے میرے اور کسی کو معلوم نہیں تھے۔ وہ میرے ہاتھ میں گلاس دے کر اپنی اس محبوبہ کے بارے میں بتانے لگا جس کی جدائی کا دن منانے کا بھی اس نے میرے سامنے اعتراف کرلیا تھا۔ ''تم اسے نہیں جانتے۔ میں نے بھی اس سے پہلے جان بوجھ کر تمھارے سامنے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ دراصل میری ہی کالج کی ایک نوعمر اسٹوڈنٹ تھی، بس اتفاق سے ہمارا یارانہ ہوگیا۔ ایک عرصے تک چلتا رہا۔ یاری کی کوئی عمر نہیں ہوتی ہے۔ تم سمجھتے ہو نا! تم تو بڑے ریئلسٹک انسان ہو لیکن اب میرے لیے اس کا ساتھ نبھانا مشکل ہوگیا۔ میری عمر بھی تو دیکھو یار! بہت تھک گیا ہوں۔ سمجھے نا۔''

وہ زور زور سے ہنس پڑا۔ اتنے زور سے کہ کھڑکی کے باہر بجلی کے تار پر بیٹھی ہوئی ایک تنہا چڑیا گھبرا کر پھر سے اڑ گئی۔ پھر وہ میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بڑی راز داری سے بولا۔ ''لیکن وہ تمھیں اچھی طرح جانتی ہے۔ تمھارے کئی ڈرامے دیکھ چکی ہے اور اس بات کے باوجود کہ میں اسے اب نہیں بلاتا، اس کا ابھی فون ضرور آئے گا۔ وہ ٹرنک کال کر کے آج کے روز مبارک باد دینا کبھی نہیں بھولتی۔''

اچانک شوبھا بھوٹانی نے ہمارے کمرے میں آ کر کہا۔ ''میں آپ لوگوں کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔ تھوڑی دیر کے لیے مارکیٹ تک جا رہی ہوں۔ گھنٹے بھر تک لوٹ کر کھانا کھلاؤں گی، تب تک شغل جاری رکھیے۔''

اپنی بیوی کے چلے جانے کے بعد بھوٹانی نے دو پیگ جلدی جلدی اور لے لیے۔ میں تو ابھی تک وہی پہلا پیگ لیے بیٹھا تھا۔ وہ ہمیشہ اسی طرح بے تحاشا پیتا تھا اور میں اسی طرح ایک یا زیادہ سے زیادہ دو پیگوں پر قناعت کرلیا کرتا تھا۔ اور اس کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ وہ دراصل میرے پروڈیوس کیے ہوئے ڈراموں کا ایک دیرینہ سرپرست تھا۔ ہال کی آدھی سیٹوں کے ٹکٹ ہمیشہ اسی کی وساطت سے بک جایا کرتے تھے۔ وہ میرے ڈرامے کی پیش کش کے روز اپنے کئی دوستوں کو بے دریغ پلایا کرتا تھا۔ دوستوں کو پلانا اس کی ہابی تھی۔ شاید میری سرپرستی بھی وہ اسی نقطۂ نظر سے کرتا تھا۔

اس کی توقع کے مطابق ہمارے وہاں بیٹھے بیٹھے ناگپور سے ٹرنک کال آ گئی، اسی لڑکی کی، جس نے اسے شادی کی چالیسویں سالگرہ پر مبارک باد دی اور بھوٹانی نے اس کا بڑی خوش دلی کے ساتھ شکریہ ادا کیا اور اسے یہ بھی بتا دیا کہ اس کی جدائی کو بھولنے کے لیے چھ پیگ پی چکا ہے۔ پھر اس نے اس لڑکی کی صحت، تعلیمی پروگریس اور نئی پرانی مشغولیات کے بارے میں پوچھا۔ اس کے بعد اسے یہ کہہ کر چونکا دیا۔ لو، اپنے محبوب ڈائریکٹر کے ساتھ بھی آج بات کر لو جس کی تم بڑی فین ہو! ان کے ڈراموں کی تم ہمیشہ بے حد تعریف کرتی ہو۔ وہ اس وقت اتفاق سے میرے پاس ہی بیٹھے ہیں۔''

یہ کہہ کر بھوٹانی نے رسیور میرے ہاتھ میں دے دیا اور میرے خالی گلاس میں ایک اور پیگ اوںڈیل کر کچن کی طرف چل دیا۔

سمرتی جندل نے میرے دو ڈراموں کی بہت تعریف کی جو دو سال پہلے میں نے سرستی بھون میں پیش کیے تھے۔ اس نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ کبھی وہ بھی میرے کسی ڈرامے میں کام کرنے کا موقعہ حاصل کر سکے۔ میں نے تو اس کی آواز سنتے ہی یہ احساس کر لیا کہ وہ ایک ایسی آواز ہے جسے سننے کے لیے میرے کان ترس رہے تھے۔ جب تک وہ بولتی رہی میرے ذہن میں ایک بہت ہی حسین و جمیل اونچے قد کی تعلیم یافتہ بالغ لڑکی کا امیج بنتا چلا گیا۔ ایک تجربہ کار پروڈیوسر کی حیثیت سے میں نے اس لڑکی اور اس کی حیرت ناک آواز کو ذہن میں رکھ کر فوراً ایک نئے ڈرامے کی روپ ریکھا تیار کر لی اور میرا اس طرح سے سوچنے کا عمل ویسا ہی تھا جیسے کوئی بے چین عورت اپنے محبوب کے ملنے کے تصور سے ہی اپنے گربھ میں اس کا بیج قبول کرنے کے لیے تیار ہو اٹھے۔

جب میں نے رسیور چھوڑا تو اسی وقت بھوٹانی ایک ہاتھ میں تازہ بھنے ہوئے اور خوشبو دیتے ہوئے گوشت کی پلیٹ اٹھائے ہوئے اندر آ گیا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے ایک بوٹی کو نوچتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس نے میرے چہرے پر ہوئے جذبات کو ایک ہی لمحے میں اپنی تجربہ کار نظروں سے بھانپ لیا اور پلیٹ میرے سامنے رکھ کر بولا۔ سمرتی مجھ سے کہیں زیادہ ذہین بھی ثابت ہو رہی تھی۔ جہاں تک آرٹ اور اس کی تنقید کا تعلق ہے اس کی ذہنی تسکین کے لیے تمھیں ہی اس کا سرپرست بن جانا چاہیے کیونکہ اس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو تم ہی ایکسپلائٹ کر سکتے ہو اور۔''

پھر وہ کچھ رک کر لیکن کسی قدر اداس لہجے میں بولا۔ ''تم اگر اس کے ساتھ عشق بھی کرنے لگو گے تو مجھے کسی قسم کا دکھ یا حسد ہرگز نہیں ہوگا۔''

اس کے بعد اس نے مجھے سمرتی جندل کا پتہ بھی لکھ کر دے دیا۔ یہ کہتے ہوئے ''جب بھی موقعہ ملے اسے بلایا کرو یا کبھی کبھی خود اس سے ملنے ناگپور چلے جایا کرو۔ تمھاری مدد سے وہ اگر شہرت کی منزلوں پر پہنچ گئی تو میں خود کو معاف کر دینے کے قابل ہو جاؤں گا کہ میں نے اتنے عرصے تک اسے اپنی قید میں کیوں رکھا؟''

اس واقعہ کے دو تین سال بعد اچانک میں نے کسی کافی ہاؤس میں قصہ سنا کہ سمرتی جندل نام کی ایک انٹیلکچول لڑکی کو باغی نسل کا کائی نیا ادیب اپنے ساتھ ساتھ لیے گھومتا رہتا ہے۔ دونوں بنا شادی کیے ایک فلیٹ میں رہنے لگے ہیں۔ جن لوگوں نے اس اسکینڈل میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی تھی ان میں زیادہ تر دوسرے درجے کے کم تنخواہ پانے والے مقامی جرنلسٹ، ناکام فوٹو گرافر اور ڈرامہ اسٹیج پر چھوٹے چھوٹے رول ادا کرنے والے اداکار ہی شامل تھے۔ وہ سب اس ادیب کے اس لیے اچانک مخالف بن گئے تھے کہ وہ پرانی قدروں کو اپنی تحریروں کے ذریعے روند ڈالنے کا عادی تھا لیکن اس کے نام کے ساتھ سمرتی جندل کی سفارش کے باوجود آج تک اسے کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ ایک بار کسی ضروری کام سے میں ناگپور گیا۔ ابھی تو اس سے ملنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ شاید میں اس بات کا منتظر رہا تھا کہ وہ خود ہی کبھی آ کر مجھ سے ملے گی۔ اب جبکہ وہ ایک غیر معروف ادیب کی داشتہ بن جانے کی وجہ سے بدنام کی جا رہی تھی۔ میرے اندر اسے تلاش کرنے کی خواہش ہی پیدا نہ ہو سکی۔ میں دراصل اس کے طریق زندگی میں دخل نہیں دینا چاہتا تھا جس راستے پر وہ چل ہی رہی تھی، اس کے لیے اسے پورا اختیار تھا۔

پھر دس سال کی طویل مدت کے بعد وہ ایک روز اچانک میرے ایک ڈرامے کی ریہرسل میں پہنچ گئی۔ جب تک ریہرسل چلتی رہی، میں نے اسے نہیں دیکھا۔ اسٹیج کے سامنے میرے آرٹسٹوں کے کتنے دوست، جان پہچان والے اور سگے سمبندھی تک سو پچاس کی تعداد میں موجود تھے۔ سمرتی بھی ان ہی لوگوں میں آگے پیچھے کی کسی کرسی پر بیٹھی رہی ہوگی۔ جب ریہرسل ختم ہوگئی تو وہ اچانک بھیڑ کو چیر کر میرے پاس چلی آئی اور اپنا تعارف راگھو بھوٹانی کے حوالے سے کرایا جسے انتقال کیے ہوئے بھی اب پانچ سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔

پہلے تو یقین ہی نہ آیا کہ یہ وہی لڑکی ہے، جس کی بے حد دلکش آواز میں نے بہت عرصہ پہلے ایک بار فون پر سنی تھی اور میں نے انہی لمحوں میں آناً فاناً اس کے بارے میں ایک ڈرامہ کا خاکہ بھی اپنے ذہن میں تیار کر لیا تھا۔ اب وہ بہ نفس نفیس میرے سامنے کھڑی تھی لیکن وہ میرے تصور کے مطابق اتنی لمبی نہیں تھی۔ وہ بمشکل پانچ فٹ کی ایک انتہائی دبلی پتلی عورت تھی۔ تیس بتیس برس کی اور بونی یعنی ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی کہا جا سکتا تھا لیکن خوب صورت اور دلکش! اس کے جسمانی اعضا میں ایک حیرت ناک مناسبت تھی اور اس کی بھوری آنکھوں میں بے پناہ حیرت اور مسرت کا ایک دلفریب امتزاج دکھائی دے رہا تھا اس کے سنشول ہونٹ نظروں کو ادھر ادھر بھٹکنے سے روک رہے تھے اور اس کے لمبے بھورے بال جو اس کی پیٹھ پر کھلے ہوئے تھے پیڈسٹل فین کی تیز ہوا سے بے اختیار اڑ رہے تھے، جنھیں وہ ایک بچی کی سی معصومیت کے ساتھ دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر پھر سے کانوں کے پیچھے جما دیتی تھی۔

میں پہلی نظر میں کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو جانے کا کبھی قائل نہیں ہو سکا ہوں اگر کوئی لڑکی واقعی دلکش ہو تو مرعوب ضرور ہو جاتا ہوں۔ عشق تو ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کی کشش کو رفتہ رفتہ ہی قبول کرنے کا ایک نفسیاتی عمل ہوتا ہے لیکن اسے دیکھتے ہی میں نے محسوس کر لیا کہ میں اس کے ماضی کے سارے اسکینڈلوں کے باوجود قبول کر سکتا ہوں اور میں اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ اگرچہ میرے اپنے آرٹسٹوں اور مداحوں کے حلقے میں انتہائی خوب صورت اور جنسی طور بھوکی لڑکیوں کی کمی نہیں ہوتی۔ ایک مبہم سے اشارے سے وہ قریب آ جاتی تھیں اور پھر میں انھیں بڑی چالاکی سے دور کر دیتا تھا۔ ایسا کرنا میرے لیے مشکل ثابت نہیں ہوتا تھا۔ لڑکیاں اپنی اپنی غرض سے میرے قریب آ جاتی تھیں۔ کچھ تو اسی گلیمر کی وجہ سے جو ہر کامیاب آدمی کو ایک ہیرو کا درجہ دے دیتا ہے اور کچھ لڑکیاں اپنی فنی پیاس ہی بجھانے کی متمنی ہوتی ہیں جو اس چکر میں اپنا جسم تک میرے جیسے لوگوں کے حوالے کرنے سے گریز نہیں کرتیں۔ سمرتی بھی اس فنی بھوک اور پیاس کی میرابی کے لیے ایک مدت سے بھٹک رہی تھی اور شاید میں غیر شعوری طور پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اب وہ اپنے آپ آ نکلی تھی۔ مجھ ہی کو ڈھونڈتی ہوئی جس کا اظہار اس نے بڑی دلیری اور بے تکلفی سے کر دیا اور ہم سب لوگوں سے الگ ہو کر سنٹرل لائبریری کے منی آڈیٹوریم سے نکل گئے۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں چلے گئے جہاں اس کا قیام تھا۔ اب وہ شادی شدہ تھی۔ مغربی جرمنی

کے ایک شہر میں وہ اپنے آرکی ٹیکٹ شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے مجھے کانو جوگلیکر کے کلر ڈفوٹو بھی دکھائے اور مجھے بتایا کہ چند روز کے بعد واپس جارہی ہے۔

ہماری باتیں بیئر، سگریٹوں کے دھوئیں اور تیز مسالے والے کھانے کے ساتھ ساتھ چلتی رہیں جو ہندستان و یورپ کے جدید ڈراموں سے ہی متعلق تھیں۔ اسے اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ اسے ابھی تک جرمنی کے چند ایک ہی ٹی وی کے ڈراموں میں کام کرنے کا موقعہ مل سکا تھا، کیونکہ وہاں ایک ہندستانی کلاکار کے لیے کام کرنے کے زیادہ مواقع نہیں تھے۔ کبھی کبھی اس نے ایک صوبائی اخبار میں ڈراموں پر ریویو لکھ کر چھپوا بھی لیے تھے تو اس کام سے اسے پورا اطمینان نہیں مل سکا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ آزاد چڑیا کی مانند دنیا کے ایسے بڑے شہروں میں گھومتی پھرے جہاں جہاں باقاعدگی سے ڈرامے اسٹیج کیے جاتے ہیں لیکن اس کی شادی اس کے لیے ایک بہت بڑی رکاوٹ بن چکی تھی۔

وہ میرے مرحوم دوست کی محبوبہ رہ چکی تھی لیکن میں اپنے دوست کی خواہش کے باوجود سمرتی سے دوستی کی شروعات نہیں کرسکا تھا اور یہ سارا عرصہ اس نے جگہ جگہ بھٹکتے ہوئے گزار دیا تھا میں نے سوچا وہ مجھ سے دور رہ کر بھی ذہنی طور پر تو قریب ہی رہی ہے۔ شاید وہ بھی یہی سوچ رہی تھی اور ابھی تک خواہش مند نظر آتی تھی کہ میں اسے اسٹیج پر آنے کی آفر دوں تو وہ کافی مدت تک جرمنی لوٹنے کا پروگرام ملتوی کردے گی۔

اس نے میرے کہنے پر دو تین سچویشنز کے ڈائیلاگ سنائے۔ ڈائیلاگ کی ادائیگی کے وقت اس کی آواز میں وہی گہرائی اور ویسا ہی لوگ لوچ پیدا ہوگیا جس کی گونج دس سال سے میرے کانوں میں موجود تھی۔ جب اس نے میرے ساتھ صرف ایک بار فون پر گفتگو کی تھی۔ میں نے خوش ہوکر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا تو اس نے کوئی جھجک نہ دکھائی۔ میں نے پہلے اس کی خوب صورت آنکھوں پر بوسے دیے پھر اس کی خوب صورت ناک کے بانسے پر اور پھر جب اس نے دیکھ لیا کہ میں اس کے ہونٹوں پر جھکا چاہتا ہوں تو وہ اچانک میری گرفت سے نکل کر الگ جا بیٹھی۔ بہت اداس لہجے میں بولی۔ ''بیٹھ جایئے اور کچھ باتیں کرلیں۔''

میں نے فوراً محسوس کرلیا کہ اس سے اجازت نہ لے کر میں نے اس کے جذبات کو کچھ ٹھیس پہنچائی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مسرور دکھائی دینے کی کوشش کرتی ہوئی نظر آئی۔ میں خود

کو شکست خوردہ سمجھنے لگا تھا، لیکن میں نے بھی اسی کی مانند اپنے آپ پر قابو پا کر بعض اچھے ڈراموں کا ذکر چھیڑ دیا۔ الیسن، ٹینسی ولیمز، اور بادل سرکار کے لکھے ہوئے۔ اس نے بھی ان ڈرامہ نگاروں کے تخلیقی کام میں بڑی دلچسپی دکھائی اور فوراً ہی ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہمارے درمیان کسی قسم کی ناخوشگواری پیدا ہی نہیں ہوئی تھی لیکن وہ پہلی عورت تھی جو میری بانہوں میں پہنچ کر بھی نکل گئی تھی جس کی وجہ سے میرے اندر اسے ٹھیک طرح سے جاننے کی خواہش بڑھ گئی۔ اس کے لیے میں نے وہی گر استعمال کیا جو کبھی خطا نہیں جاتا تھا یعنی اس کی تعریف۔ اور وہ واقعی اس کی بھوکی تھی۔ وہ خود ہی کہہ اٹھی۔ ''یورپ میں بعض لوگ میری آنکھوں کی رنگت اور ناک کی ساخت کی وجہ سے گریک سمجھ بیٹھتے ہیں۔ میں انھیں بتاتی ہوں کہ میں خالص ہندستانی ہوں۔ گریک ہرگز نہیں ہوں۔ تب بھی انھیں یقین نہیں آتا۔ کہتے ہیں کہ میری ماں ضرور گریک رہی ہوگی۔ اتنی خوب صورتی مکسڈ بلڈ کا ہی نتیجہ ہو سکتی ہے۔'' اور وہ بے اختیار ہنستی ہوئی بولی۔ ''ایک نوجوان امریکی پروفیسر نے شرط لگا کر مجھے جرمن دا سپینش خون کی مخلوط پیداوار قرار دے دیا تھا۔''

''اور تم وہ شرط جیت گئی تھیں؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''جیتتی کیسے نہیں؟'' وہ اپنے لمبے اور کھلے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں لے کر سہلاتی ہوئی بولی۔ ''وہ دراصل مجھے دو ہزار ڈالر دے کر میرے ساتھ کچھ ملکوں میں گھومنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی یہ خواہش رد نہ کی۔''

اپنی تعریف خود کرنا اور دوسروں کی زبانی سنتے رہنا دراصل ایک قسم کا نشہ ہوتا ہے۔ اس معاملے میں اسے میں نے بے حد معصوم پایا۔ کچھ دیر بعد میں وہاں سے اٹھا تو وہ خود بھی میرے سینے کے ساتھ آ لگی۔ اس بات کو وہ بھولی نہیں تھی کہ تھوڑی دیر پہلے اس نے میری حوصلہ شکنی کی تھی۔ شاید اسی لیے وہ مجھے ذہن نشین کرانے کے لیے بولی۔ ''میں آزاد ضرور ہوں لیکن اپنی آزادی کا کسی قیمت پر سودا نہیں کر سکتی ہوں۔ مغربی ماحول کی تربیت نے میرے اندر اتنی جرأت تو پیدا کر دی ہے...... کہ میں اپنی مرضی سے کسی بھی شخص سے مل سکتی ہوں۔ لیکن کوئی اگر یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ مجھے میری مرضی کے خلاف اپنی ملکیت بنالے گا تو اسے مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔''

میں بڑی خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ کاروِیڈور میں چلتا رہا۔ اس نے خود ہی میرا ایک بازو بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور سر اٹھا اٹھا کر میری طرف دیکھتی ہوئی کہتی جا رہی تھی۔

''عورت مردوں کے ہاتھوں بہت دکھ اٹھا چکی ہے۔ اس دکھ کی داستان کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ جب جب ہندستان کے بڑے اور چھوٹے ادیبوں اور آرٹسٹوں سے ملی۔ انھوں نے مجھے محض ایک عورت سمجھا۔ اپنی بھوک مٹانے کا ایک ذریعہ۔ میں ایک عورت کے علاوہ بھی تو کچھ ہوں۔ وہ لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ میرے دل میں اب ان کے لیے نفرت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔''

میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی تو انہی غیر مہذب لوگوں میں سے ایک ہوں۔''

لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھ سے پھر کبھی ملنے کا وعدہ کیا۔ مسکراتے ہوئے اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔ میں نے صرف ایک بار سر گھما کر اسے دیکھا کہ وہ اپنے اندر برہمی کو دبا کر کس انداز سے چلتی ہے؟ وہ اپنے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر جلدی جلدی ایک طرف جوڑے میں سمیٹتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس کی شرٹ کا کونہ اس کی پرانی جینز میں سے نکل گیا تھا۔ اس نے بھی کارڈیور کا موڑ کاٹنے سے پہلے سر گھما کر دیکھا اور مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر مسکرا دی اور دیو کر کے چلی گئی۔

اگلے روز وہ ریہرسل دیکھنے کے لیے پھر اچانک آ گئی تو پہلے کی طرح مسرور تھی۔ اب وہ میرے ہی پاس کرسی پر بیٹھ کر اداکاری کرنے والے لوگوں کے بارے میں سرگوشیوں میں تبصرہ کرتی رہی۔ وہ مختلف موقعوں پر اداکاروں کے اسٹیج پر نمودار ہونے اور مناسب مقامات پر کھڑے ہو کر بولنے کے آرٹ کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی وہ کچھ لائٹ ایفیکٹس کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی تھی۔

کام ختم ہو جانے کے بعد میں اسے ایک بار میں لے گیا جو ملکی و غیر ملکی ٹورسٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ہمیں ایک میز پر جگہ ملی تو اس نے اپنے ہونٹوں سے بیئر کا جھاگ پونچھتے ہوئے بتایا۔ ''میں اپنے انجینئر باپ کے دس بیٹوں اور بیٹیوں میں چھٹی اولاد ہوں۔ میرے ماں باپ کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اسے اس کی بڑی بہن نے یقین دلایا تھا کہ وہ اپنا ایک لڑکا اس کی گود میں ضرور دے دے گی۔ جیسے ہی وہ پیدا ہوگا۔ اور جب وہ اس کے بچے کے پیدا ہونے کی خبر سن کر اپنی بہن کے پاس گئی اور اس کے سامنے اپنی جھولی

پھیلا کر کھڑی ہوگئی تو وہ صاف مکر گئی۔ بڑے غرور سے بولی۔'اری بہن! مانگنا ہے تو بھگوان سے مانگ! کیا کسی انسان نے بھی اپنی اولاد کو بھیک میں دیا ہے۔؟'' یہ سن کر اس بے چاری کے دل پر بڑی چوٹ لگی۔ اس نے میرے باپ کو مجبور کر کے خود اس کی ایک اور لڑکی سے شادی کرائی۔ اسی نے میرے باپ کو دس بچے دیے تھے اور پھر وہ مر بھی گئی۔ میری سوتیلی ماں ابھی تک زندہ ہے۔ اس نے چوٹ کھا کر میرے باپ کی شادی نہ کرائی ہوتی تو آج میرا بھی کہاں وجود ہوتا!''

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی اور میری سگریٹ اٹھا کر پینے لگی۔ دو چار لمبے لمبے کش لیے اور اپنے گرد بہت سا دھواں بکھیر لیا۔ اور پھر بولی۔ ''میرے سارے بھائی بہنیں ہمارے باپ کی طرح لمبے تڑنگے ہیں۔ صرف میں ہی بے حد کمزور اور چھوٹے قد کی رہ گئی ہوں۔ لیکن میری طرح لٹریچر اور آرٹ سے کسی کو بھی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ کو ایک اور دلچسپ بات بتاؤں؟ میں نے اپنے بارے میں اپنے ماں باپ کو ہمیشہ لڑتے جھگڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے درمیان بیس سال کا فاصلہ تو تھا لیکن وہ سمجھتے تھے میں ان کی جائز اولاد نہیں ہوں کیونکہ میری کوئی پہچان اپنے باپ کی شخصیت کے اندر نظر نہیں آتی تھی۔ نہ ہی میری اپنی ماں کی لیکن میری ماں اس الزام کو بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی جس پر وہ انھیں گالی بھی دے بیٹھی تھی اور ان کے ہاتھوں سے پٹتی بھی بہت تھی۔ اسی لیے میری تمام تر ہمدردیاں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھیں لیکن میں اپنے باپ کے خلاف زبان تک نہیں ہلا سکتی تھی۔ بس صرف کوس سکتی تھی اور سوچ سکتی تھی۔ شاید اسی طرح رفتہ رفتہ میں نے اپنی ذاتی آزادی کو اہمیت دینا اور اس کی حفاظت کرنا سیکھا ہے۔''

جب میں اسے اس کے ہوٹل تک چھوڑ آنے کے لیے ساتھ چل رہا تھا تو اسے میں نے بھیڑ کے اندر کئی لڑکوں کے ساتھ الجھتے اور انھیں کوستے ہوئے دیکھا۔ بعض لڑکے جان بوجھ کر اس کے ساتھ کندھا رگڑتے ہوئے نکل جاتے تو وہ زخمی شیرنی کی طرح بپھر اٹھتی تھی۔ میں نے ان لوگوں سے بس ذرا سا پروٹسٹ کر کے سمرتی جوگلیکر کو بازو کے حلقے میں لیے ہوئے آگے بڑھ جانا ہی بہتر سمجھا تھا۔ میں نے اسے ہندستانی ماحول کے بارے میں سمجھانے کی کوشش کی جو مغربی آداب سے واقف نہیں تھا۔ تو اس نے مجھے بڑی بے خوفی سے سماجی بزدل اور سمجھوتے باز تک کہہ ڈالا۔ میں نے اسے بتایا۔ ''دیکھو یہاں کے لڑکے تو غیر ملکی لڑکیوں کو بھی اسی طرح چھیڑا کرتے ہیں۔ ان کو دیکھ دیکھ کر سیٹیاں بجاتے ہیں۔ اشارہ کرتے ہیں لیکن وہ صرف مسکرا کر آگے

بڑھ جاتی ہیں۔

اس نے اسی برہمی سے جواب دیا۔ ''میں جانتی ہوں۔ یہاں تو وہ ان کا لحاظ کر کے خاموش رہ جاتی ہیں لیکن اپنے ملک میں واپس جا کر وہی لڑکیاں اپنے ہاں کے اخباروں میں شکایتوں سے بھرے ہوئے خط چھپواتی ہیں۔ اس سے ہمارے ملک کی کتنی بدنامی ہوتی ہے۔ اس کا یہاں کسی کو احساس نہیں ہے۔ اگر اپنی لڑکیوں کو اس طرح ان کے ملک میں چھیڑا جائے تو وہ فوراً تھپڑ مار دیں گی۔ لڑکیوں کو چھیڑنا بھی ایک آرٹ ہوتا ہے اور کوئی بھی لڑکی مردوں کو اپنی طرف متوجہ پا کر دل ہی دل میں خوش ہوتی ہے۔ وہ صرف بے ہودگی برداشت نہیں کر سکتی۔

راستے میں ایک جگہ پوری سڑک کو ایک ٹرک نے گھیر رکھا تھا۔ جس پر عمارتی لکڑی کے مشین سے تراشے ہوئے بڑے بڑے شہتیر لدے ہوئے تھے۔ بہت تھوڑی سی جگہ بچی ہوئی تھی وہاں سے موٹریں، بسیں اور دوسری گاڑیاں بہت دھیرے دھیرے سے گذر رہی تھیں۔ میں تو ٹریفک میں پھنسی ہوئی ایک رکشا پر سے کود کر نکل گیا لیکن سمرتی اپنے چھوٹے قد کی وجہ سے ایسا نہ کر سکی۔ پہلے تو اس نے میری طرف بڑی بے بسی سے دیکھا پھر غصے سے اپنے سڈول بازو اٹھا کر بولی۔ ''آپ مجھے اٹھا کیوں نہیں لیتے؟''

اس نے یہ مطالبہ اتنی اونچی آواز میں کیا تھا کہ آس پاس کے کتنے لوگ ہم دونوں کو گھورنے لگے اور جب میں نے اسے واقعی اپنے بازوؤں میں بھر کر اپنی طرف اتار لیا تو کئی لوگ ہنس دیے میری تو کانوں کی لوئیں تک سرخ ہو گئیں لیکن وہ ان لوگوں کے ساتھ مل کر ہنسنے لگی۔ جیسے جو کچھ ہوا تھا، وہ محض ایک تماشا تھا۔

پھر دو سال کے بعد ایک روز اچانک میں نے اسے ناروے کی راجدھانی اوسلو میں دیکھ لیا۔ میں وہاں ایک ہیئر کٹنگ سیلون میں بال بنوانے کے لیے گیا تھا۔ وہ بھی ایک اور شخص کے بال تراش رہی تھی۔ جب اس نے میری طرف نظر اٹھائی تو پہلے تو حیران ہوئی۔ پھر مسکرا دی لیکن اپنے کام میں لگی رہی۔ میں اپنی ہیئر ڈریسر کے سامنے سر جھکائے ہوئے بیٹھا یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا۔ وہ جرمنی سے یہاں کیسے پہنچ گئی اور بال تراشنے کے پیشے میں؟ کہیں مجھے غلط فہمی تو نہیں ہوئی لیکن میں نے جب جب موقعہ پا کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی طرف ویسی ہی دلچسپی سے مسکراتے ہوئے پایا۔ وہ بھی بار بار میری طرف دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ میں جب

باہر آنے لگا تو وہ لپک کر میرے پیچھے چلی آئی۔ ہیئر ڈریسنگ سیلون کا ورکنگ کوٹ اور ٹوپی پہنے ہوئے بولی۔

''آپ یہاں کب تک ہیں؟ آج میں آپ سے مل سکتی ہوں، لیکن دو بجے تک بے حد مصروف ہوں۔ اس کے بعد یا تو مجھے یہیں سے پک اپ کر لیجیے یا پھر اپنے ہوٹل کا پتہ بتا دیجیے۔ میں خود آ جاؤں گی۔''

اسے دیکھ کر میں ابھی تک اپنی خوشی پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ شام کے چھ بجے تک میں بھی بہت مصروف تھا۔ اس وقت سیدھا ایک تھیٹر ورکشاپ میں کچھ لوگوں سے ملنے کے لیے جا رہا تھا۔ لنچ کے بعد ابسن کے ڈراموں پر مباحثے میں شریک ہونا تھا اور شام کو میں جو ڈرامہ دیکھنے کے لیے ٹکٹ لے چکا تھا وہ اتفاق سے مجھے بڑی مشکل سے ملا تھا اور وہ ایک ہی تھا۔ اب تو دوسرا ٹکٹ حاصل کر لینا ناممکن نظر آتا تھا۔ پھر بھی میں نے سمرتی کے سامنے یہ تجویز رکھ دی۔ ''تم شام کو نیشنل تھیٹر آ جانا۔ ہو سکتا ہے کوئی ٹکٹ کینسل کرانے آ جائے۔ ورنہ میں اپنا ٹکٹ کینسل کرا لوں گا۔

اس نے جواب دیا۔ ''میں یہ ڈرامہ دیکھ چکی ہوں۔ اب میں رات کو ہی ڈرامہ ختم ہونے کے بعد اسی تھیٹر کے سامنے کلب میں مل جاؤں گی۔''

اتنا کہہ کر وہ سیلون کے اندر چلی گئی۔ میں دن بھر اس سے ملنے کے تصور میں کھویا کھویا رہا۔ شام کو تھیٹر کے اندر بھی میری نظریں اسی کو تلاش کر رہی تھیں کہ شاید اسے کسی طرح ٹکٹ حاصل ہو گیا ہو۔ اگرچہ وہ وہاں موجود نہیں تھی لیکن میں جیسے ڈرامے کی ہر ایک پوزیشن میں اسے اپنے ساتھ ہی بیٹھا محسوس کر رہا تھا۔ ڈرامے کا سیٹ، لائیٹ، ایفیکٹس، موضوع کی ٹینشن وغیرہ۔ جن جن رموز کو وہ بھی سمجھتی تھی، اور میرے ساتھ کئی بار بحث کر چکی تھی۔ میں اب بھی اس کی پسند اور ناپسند کا اندازہ لگا رہا تھا۔ ڈرامہ عورتوں کی جنسی آزادی سے متعلق تھا۔ اس آزادی کے حصول کے لیے مغرب کی عورت ابھی تک مردوں کے سماج کے ساتھ لڑ رہی تھی۔ ان کے بنائے ہوئے قوانین کو کورٹ میں چیلنج کر رہی ہے۔ مرد اگرچہ اصولی طور پر اس آزادی کو تسلیم کر چکا ہے لیکن عورت اس کی اس حمایت کو بھی اس کی انفرادی خود غرضی کی علامت سمجھتی ہے اور وہ ڈرامہ اتفاق سے ایک خاتون کا ہی لکھا ہوا تھا۔

میں ہال سے باہر آیا تو سمرتی جوگلیکر کو جورین کوٹ پہنے تھی، انتظار میں کھڑا ہوا پایا۔ اس

وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی وہ مجھے دیکھتے ہی میرے ساتھ لپٹ گئی۔ ہم دونوں کلب میں جا کر بیٹھ گئے اور اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''یہ اچھا ہوا کہ آپ مجھے اس قدر اچانک اس شہر میں مل گئے۔ ان دنوں میں بہت اداس تھی۔''

دو ایک پیگ پی لینے کے بعد اس نے بتایا۔ ''جوگلیکر کے ساتھ میرا جھگڑا ہو گیا ہے۔ اس لیے میں یہاں چلی آئی۔ گرمیوں کی چھٹیوں بھر کے لیے مجھے سیلون میں جاب مل گئی۔ اتفاق سے اس کام کا ڈپلومہ میرے پاس تھا۔''

میں نے دیکھا وہ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی پینے لگی تھی لیکن میں نے اسے روکا نہیں۔ اس کا ذہن گھریلو پریشانیوں سے ہٹانے کے لیے اس ڈرامے کے بارے میں بات کرنے لگا جو دیکھ کر آیا تھا۔ وہ بولی۔

''میں بیورو یک کو جانتی ہوں۔ وہ بہت اچھے اچھے ڈرامے لکھ چکی ہے اور وہ کہیں بھی مبہم نہیں ہے، ورنہ کئی جدید ڈرامہ نگار ابسٹریکٹ ہوتے جا رہے ہیں۔''

جب ڈانس شروع ہو گیا تو ہم بھی فلور پر چلے گئے۔ اس نے میرا ساتھ پسند کیا اور میرے بازوؤں کے حلقے میں آکسٹرا کی دھیمی دھیمی دُھن پر آہستہ آہستہ ناچتی رہی۔ اس نے اپنے لمبے بال اب باب کرا لیے تھے۔ اس کا چھوٹے چھوٹے بالوں سے بھرا ہوا سر میرے سینے کے ساتھ لگ رہا تھا جسے دو ایک بار جھک کر میں نے چوم لیا تو وہ سر اٹھا کر مسکرا دی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہو گئی تھی جیسے اس کا اعتماد اچانک لوٹ آیا ہو۔

ہم نے کھانا بھی وہیں کھا لیا تھا۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ میری قیام گاہ پر چلی گئی۔ وہاں آدھی سے زیادہ رات بیت جانے کے باوجود ہماری باتیں ختم نہ ہو سکیں۔ ہم ابھی تک ڈراموں پر ہی گفتگو کر رہے تھے۔ اس دن وہ اس قدر خوش تھی کہ اسے جتنے ڈراموں کے مکالمے یاد تھے وہ اس نے پوری اداکاری کے ساتھ میرے سامنے دہرا ڈالے۔ محبت، لڑکپن، شوخی، غصہ، حسد، مکاری، ممتا، دکھ، جنسی خواہش وغیرہ، ہر قسم کے جذبات پر اسے حیرت ناک قدرت حاصل تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا کہ ابھی تک میں اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا ہی نہیں سکا تھا۔ شاید اس غلطی کی تلافی کرنے کے لیے میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اسے ہندوستان واپس لے چلنے کی پیش کش کر دوں اور اسے آئندہ ہمیشہ ساتھ رکھوں اور انہی لمحوں میں جذبات

سے مغلوب ہو کر اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں سر سے بہت اوپر اٹھا لیا۔ اس نے بھی ہنستے ہنستے میرے بالوں کو مضبوطی سے پکڑ کر نوچ لیا۔ پھر میرے سر پر زور زور سے تھپڑ مارنے لگی تاکہ میں اسے نیچے اتار دوں۔ لیکن میں اسے سیدھا بستر پر لے گیا۔ گہرے اسپرنگ والے بستر پر، وہ گرتے ہی کود کر نیچے اتر گئی اور بڑی بے چینی سے ننگے پاؤں ادھر ادھر گھومنے لگی۔ میں بستر کے کنارے پر بیٹھا نظروں سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔ اس نے میرے ساتھ ایک بار بھی نظر نہ ملائی۔ پھر میں مایوس ہو کر لیٹ گیا۔ اس کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ میں نے پھر اس کی توہین کر دی تھی جس کا مجھے کوئی حق نہیں تھا۔ میں کتنی دیر تک اس سے معافی مانگنے کے لیے الفاظ ڈھونڈتا رہا پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ کمرے میں موجود نہیں ہے۔ وہ پتہ نہیں کب دروازہ کھول کر باہر چلی گئی ہے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے جوتے قالین پر پڑے تھے۔ ایک سیدھا دوسرا الٹا۔ اور اس کا ہرا رین کوٹ کھلی الماری میں ہینگر پر لٹکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

میں دھیرے سے اسے تلاش کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔ جانے سے پہلے باتھ روم میں بھی جھانک لیا تھا۔ پھر دو لمبے کاریڈوروں میں سے ہو کر جب نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو سیڑھیوں کے درمیان میں ہی بیٹھی ہوئی دکھائی دے گئی۔ بڑی خاموشی سے بیٹھی سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہی تھی۔ میں بھی اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس کی سگریٹ کی ڈبیا اٹھا کر ایک سگریٹ سلگانے لگا۔ اس نے میری طرف بڑی گہری نظر سے دیکھا اور بولی۔

''میں مردوں کی صرف اسی ایک بات سے سخت نفرت کرتی ہوں، جب وہ اپنا بھاری بھرکم وجود عورت کے بدن پر زبردستی لاد دیتے ہیں۔ جوگلیکر بھی اسی قسم کا ایک حیوان ہے جسے چھوڑ کر میں یہاں چلی آئی تھی۔ پتہ نہیں! تم لوگوں کو سزا دینے کے لیے کب کوئی قانون بنایا جائے گا؟ اس کے لیے تو موت کی سزا ہونی چاہیے۔ بھوٹانی زندہ ہوتا تو اسے میں اپنے ہاتھوں سے گولی کا نشانہ بنا دیتی۔ مردوں سے نفرت کرنا مجھے اسی نے سکھایا ہے۔ شاید اب میں زندگی بھر اس نفرت سے چھٹکارا نہیں پا سکوں گی۔''

یہ کہتے کہتے وہ اپنے گھٹنوں پر سر ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

گزرتے لمحوں کی چاپ

کانپور پہنچ کر میرے پروگرام میں سب سے پہلے انکل سے ملنا شامل تھا۔ اپنی آنٹی کی موت پر افسوس ظاہر کرنے کے لیے۔ میں لندن میں تھی جب اس کے انتقال کی خبر ملی تھی، تب سے میں نہ جا سکی تھی۔ جانا بہت مشکل تھا۔ ایک ڈاکٹر کے لیے اپنے شہر ہی میں اپنے پیشے کے علاوہ کسی اور کام کے لیے جانا، ناممکن ہوتا ہے۔ اتفاق سے مجھے ہندستانی میڈیکل کالجوں کے کئی سیمناروں میں شرکت کی آفر مل گئی۔ روپے کا لالچ بھی یقیناً تھا، لیکن صدیق سے ملنے کے لیے میں ایک بار ہندوستان ضرور جانا چاہتی تھی۔ چودہ سال ہو گئے تھے، اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، جب سے ہندوستان چھوڑ کر پاکستان گئی تھی، خیال ہوا، سب سے پہلے اسی سے کیوں نہ ملوں!

صدیق نعمانی کتنا عجیب آدمی تھا! اب تو زمانہ بیت گیا۔ آج اتوار ہے، یقیناً گھر پر ہوگا۔ میں اس کا فون نمبر ڈھونڈنے لگی۔

''میں صدیق صاحب سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''ہیلو ثریا!!!'' ادھر سے وہ دہاڑا۔

''صدیق! تمھیں کیسے معلوم ہو گیا یہ میں ہوں؟''

بولا۔ ثریا! یہ آواز تو میں ہر جگہ پہچان سکتا ہوں! کسی بھی وقت!''

''تم کمال کے آدمی ہو! معلوم ہے آج میں نے چودہ سال کے بعد تمھیں پھر فون

کیا ہے!''

''ہاں چودہ سال پہلے! 9 فروری 1900 بچپن میں کیا تھا نا!''

''اوہ خدا!! کس غضب کا حافظہ رکھتے ہو! اچھا سنو! ناراض نہ ہونا۔ آنے سے پہلے تمھیں اطلاع نہ دی۔ جانتے ہو ایک ڈاکٹر کی لائف! اچھا آج تم لنچ پر مل سکتے ہو؟ لیکن میں تمھارے گھر نہ آؤں گی اور وجہ بھی نہ پوچھو۔''

''ثریا!''

''میری کوئی انگیجمنٹ نہیں ہے آج! آئی ایم فری!''

''بہت خوب! اب پروگرام بناؤ۔ اس وقت بارہ بجے ہیں۔ ایک بجے کیسا رہے گا؟۔ کہاں ملیں؟ تم سول لائنز میں ہو نا!''

''میں اس وقت کنٹونمنٹ میں۔ میرے میزبان کے پاس جیپ ہے۔ میں کوالٹی پہنچ سکتی ہوں یا پھر کسی دوسری جگہ! جہاں کہو!''

''کوالٹی ٹھیک رہے گا۔ میں ابھی روانہ ہو جاؤں گا!''

''گڈ! میں بھی آدھ گھنٹے میں پہنچ جاؤں گی۔''

''لیٹ نہ ہو جانا کہیں!''

''نہیں ہوں گی!''

ایک بڑی مصیبت سے بچ گئی۔ میں کسی اور جگہ لنچ نہیں کھانا چاہتی تھی۔ انکل کے یہاں جاتی تو پھنس جاتی۔ ایک پروفیسر نے میرے پہنچنے سے پہلے میرے میزبان کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ فون پر فون کیے تھے اس نے۔ اچھا ہوا، اس نے میری طرف سے لنچ کی دعوت قبول کر لی تھی۔ اب میں آزاد ہوں۔ کسی اجنبی کے ساتھ نہیں، اپنے صدیق کے ساتھ کھانا کھاؤں گی۔''

صدیق مجھے چودہ سال کے بعد ملے گا۔ اتنا عرصہ میں کیا کیا کرتی رہی! کہاں کہاں رہی! اسے کیسے بتاؤں گی! تب میں کتنے سال کی تھی! تیئس سال کی! خدایا! تب میں کیسی تھی! دنیا کے گرد چکر کاٹتی پھرتی تھی۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں۔ دوسرے سے تیسرے! اس زمانے میں ایک آدمی میرے ساتھ تھا! جوزف! مدراس ہی سے مل گیا تھا۔ صدیق اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ کبھی جان بھی نہ پائے گا! کیا زمانہ تھا وہ بھی! محبتیں۔! اشارے، خوشامدیں،

ضدیں! اور حسد اور سازشیں۔ میں صدیق کو اب بھی پہچان لونگی چھوٹے قد کا! دو سال عمر میں کم! کتنا معصوم! ہمیشہ رومانٹک! نیا نیا سیلز ٹیکس ڈپارٹمنٹ میں نوکر ہوا تھا۔ آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ پورا یتیم! تب ہم کتنے گندے مکانوں میں رہتے تھے۔ ہولناک!!

اس کا کمرہ، میرا کمرہ۔ میرے گھر والوں کا مکان کرائے کا تھا۔ اسے ایک کمرہ سب لیٹ کر دیا گیا تھا۔ اس مکان کی بدبو اب بھی یاد آتی ہے۔ مکان کی مالکن بھی یاد آتی ہے۔ ہر وقت کرایہ داروں کے سر پر سوار رہا کرتی تھی۔ وہاں کے کچھ دوسرے کرائے دار بھی یاد آتے ہیں۔ لینا اگروال بھی میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ شکنتلا سکسینہ ایک فوجی کی بیوی۔ اپنے شوہر کا ہمیشہ انتظار کیا کرتی۔ دوسری عالمی جنگ میں جو گم ہو گیا تھا! اسے کبھی یقین نہ آتا تھا، وہ مر چکا ہوگا۔

یہ سب لوگ مجھے ہمیشہ عید اور نئے سال کی مبارک باد کے کارڈ بھیجا کرتے تھے۔ صدیق نے تو کوئی سال خالی نہ جانے دیا۔ اس کے کارڈ مجھے ہر جگہ ملتے رہے۔ پاکستان، فرانس، اسپین، اٹلی، آسٹریا۔ میں ان کے اوپر چھپی ہوئی رنگ برنگی تصویریں دیکھتی رہتی مگر کبھی جواب نہ دیتی۔ آخری کارڈ مجھے لندن ہی میں ملا تھا۔ وہ ابھی تک میرے پاس ہے میرے ساتھ کسی سوٹ کیس میں!

میں نے جلدی جلدی باہر جانے کے لیے کپڑے بدلے۔ ایک بج چکا تھا۔ اوہ خدا! آج تو خاصی سردی ہے! کان پور میں بھی ایسی سردی پڑنے لگی! اور بھیڑ بھی ایسی جس کا لندن میں بیٹھ کر کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ لوگوں سے بھری ہوئی سڑکوں پر سے کتنی بے پروائی سے ڈرائیور بسیں نکال کر لے جاتے ہیں۔ میری جیپ کا ڈرائیور ان سے بھی زیادہ بے رحم ہے! مجھے کوالٹی پہنچانے سے پہلے کوئی حادثہ نہ کر دے۔ سینتیس سال کی عمر میں میں کتنی محتاط ہو گئی ہوں! چودہ سال پہلے تک ان ہی سڑکوں پر میں خود کتنی تیزی سے سائیکل دوڑایا کرتی تھی! لینا اگروال اور نجمہ صدیق! جب ہم پکنک منانے نکلتے تھے، سڑکوں پر سائیکل ریس سی شروع ہو جاتی تھی۔ اب مجھے سائیکل چلانی پڑ جائے تو شاید چند ملی میٹر بھی نہ جا سکوں پورا راستہ ہی مجھے سائیکل تھامے ہوئے پیدل جانا پڑے گا! میں اب اس شوخی اور تیزی سے سائیکلنگ نہ کر سکوں گی! ناممکن! ''ڈرائیور وہاں روک لو! سامنے!''

سڑک کے پار کوالٹی کے دروازے کے پاس یقیناً وہی کھڑا ہے۔ مسکرا رہا ہے۔ اس

نے مجھے پہچان لیا ہے۔ مجھے یاد آ رہا ہے، اس کا سانولا مرجھایا ہوا چہرہ! ہوا میں اڑتے ہوئے بال! خاص طرح کے دانت!

''ہیلو صدیق! تم ابھی تک ویسے کے ویسے ہو! ذرا نہیں بدلے!''

''ثریا! یہ تم ہو! تم بھی بہت زیادہ نہیں بدلیں!''

اسے دیکھ کر میں ایک دم نروس ہونے لگی ہوں۔ کیوں! اس کے سامنے پہنچ کر یکا یک مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے! وہ میرے آگے چل پڑا ہے۔ میں اس کی پیٹھ دیکھ سکتی ہوں۔ چھوٹے قد کے آدمی کی پیٹھ بھی کتنی مردانہ ہوتی ہے! وہ اب بھی پرکشش ہے! کیا ہم سیدھے کھانے کی ٹیبل پر ہی جا کر بیٹھ جائیں گے! کھانے میں لگ جائیں گے!

''ثریا! ہمارے پاس باتیں کرنے کے لیے بہت وقت ہے! ہمیں باتیں بھی بہت سی کرنی ہیں! کرنی ہیں نا! اچھا یہ بتاؤ، یورپ میں تو عورتیں ڈرنک بھی کرتی ہیں۔ تم کھانے سے پہلے کچھ لوگی!''

''اوہ نو! صدیق! وہاں تو سب چلتا ہے۔ مجھے ساتھ دینا ہی پڑتا ہے۔ مگر یہاں تو سب لوگ دوسری طرح کے ہیں نا! سب گھورنے لگیں گے! میں تو بے ہوش ہو جاؤں گی!''

''گھبراؤ مت! یہاں کئی عورتیں ہوں گی! یہ شراب کا بہت ہی ماڈرن بار ہے! یہاں آ کر عورتیں ذرا نہیں گھبراتیں! جو شراب نہیں پیتیں، وہ مردوں کے ساتھ بیٹھ کر کوکا کولا پی لیتی ہیں۔

''صدیق! مجھے دیکھ کر تم خوش ہوئے؟''

''ثریا! مجھے یقین ہی نہیں آتا، یہ تم ہو!''

''اور ابھی تم نے کہا تھا میں ذرا نہیں بدلی!''

''تم واقعی نہیں بدلیں ثریا! لیکن جب کوئی بہت عرصے کے بعد دکھائی دے جاتا ہے تو آدمی بالکل حیرت میں ڈوب جاتا ہے! آؤ اس میز پر بیٹھیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے، وہاں نزدیک کی دو میزوں پر دو عورتیں اور بھی ہیں! کم سے کم اس بار کو دیکھ کر تو کہا جا سکتا ہے کہ کانپور ایک ماڈرن سٹی ہے، دنیا کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح!''

''بس یہی ایک کونہ دیکھ کر اسے ماڈرن کیسے کہا جا سکتا ہے۔ وہی چند لوگ روز ہی یہاں آتے ہیں، جنھیں دیکھتے دیکھتے قسم خدا کی جی اوب گیا ہے۔''

''صدیق! تم ابھی تک اسی طرح ہو! ذرا نہیں بدلے! اتنے اچھے۔''

''لیکن تم ہمیشہ تو اتنی نہیں پیا کرتے ہو نا! صدیق! تم دیکھنے میں ایسے نہیں معلوم ہوئے کہ ہمیشہ زیادہ پیا کرتے ہو گے!''

''میں ہمیشہ تو ثریا مارکنڈے کے ساتھ لنچ پر نہیں آتا ہوں! تمھیں یاد ہے ثریا! ہم نے آخری بار لنچ کہاں کھایا تھا؟ یاد کرو..... وہ عمر خیام ریسٹوران تھا! انڈے ابلوائے تھے اور مچھلی منگوائی تھی اور ہمارے ساتھ تمھاری سہیلی لینا اگروال بھی تھی! کتنا اچھا گاتی تھی وہ! مجھے آج اس کے گانے یاد آتے ہیں۔

سب راہیں تیری جانب جائیں، میں جاؤں کس اور
چاندنی رات ترا ہی مکھ ہے، ترا ہی روپ ہے بھور

''صدیق! ڈیئر صدیق! اتنی اونچی آواز میں نہیں، ہمیں باہر نکال دیا جائے گا۔''

''اُف میں کیا کروں! یہاں میڈیکل کالج کے کچھ پروفیسر یا اسٹوڈنٹ ہی موجود نہ ہوں۔''

تو کندن سی اوس میں ڈھل کر بکھرے شام ڈھلے
چندا کے زینے سے اترے آدھی رات کا چور

''ثریا! میں گا بھی سکتا ہوں اسے!''

تو سورج کی آنکھ سے جھانکے پل پل دار کرے
میں اک پیڑ کی گھائل چھایا، میرا کس پر زور!

''یاد کرو ثریا! تم اور لینا! ہمارے کچہری روڈ کے بوسیدہ کوارٹر اور کبھی کبھی رومانٹک اسکیپ! گھر والوں سے چھپ کر! ہم کہاں کہاں جا کر نہ ملتے تھے! اتنے غریب تھے! موتی جھیل کا کنارا ہی اکثر میسر آتا تھا ہمیں! تم چلی گئیں تو میں اکثر وہاں اکیلا ہی جاتا رہا، تمھیں پکارنے کے لیے! پھر میں نے بار کا راستہ دیکھ لیا۔''

صدیق کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے، اس کی ننھی ننھی مونچھوں میں آ کر مل گئے۔

''ثریا! تمھارے چلے جانے کے بعد لینا اگروال میرا ساتھ دینے لگی۔ لینا جس نے تمھاری محبت میرے دل میں گہری کی تھی! تمھاری باتیں سنا سنا کر! تمھارے پیغام لا لا کر! ہم اس

کی موجودگی میں بھی تو محبت کیا کرتے تھے! اس نے کبھی رشک ورقابت کا اظہار نہیں کیا تھا! وہ اتنی اچھی لڑکی تھی! پھر وہی میری دم ساز بھی بنی! ہم نے بہت سا وقت ساتھ گذارا۔ تمھارے چلے جانے کے بعد کئی سال تک! تمھیں بھی یاد کرتے رہے! اس میں وہ کتنی خوش تھی! کتنی مطمئن تھی! تمھیں کیسے بتاؤں! تم تو اندازہ نہ کرسکو گی۔ اب وہ زندہ نہیں ہے! ثریا! وہ بھی جا چکی ہے! تم تو واپس آ گئی ہو؟ مگر وہ کبھی نہ آئے گی! خدا اس کی روح کو سکون بخشے۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی! بہت ہی اچھی تم آ گئی ہو! ثریا! میرے ساتھ بیٹھی ہو! چودہ برس کے بعد میرے ہاتھ میں پھر تمھارا ہاتھ ہے۔ ان لمحات کا انتظار میں نے ہمیشہ کیا ہے۔ پیاری لینا اگروال! آؤ ایک جام لینا کے نام پر بھی پئیں! لینا اگروال کی بیٹی کی یاد میں۔۔ خدا اس کی روح کو سکون بخشے۔''

وہی تھے! پاکستانی! لیکن دراصل ہم امریکہ اور انگلینڈ سے لڑ رہے تھے۔ کیونکہ سارا منصوبہ ان ہی شاطروں کا بنایا ہوا تھا۔ ہتھیار بھی انھوں نے دیے تھے۔ وہی چاہتے تھے کہ جنگ دنیا کے اسی حصے میں لڑی جائے! اس میں کتنے ہندستانی بے قصور مارے گئے!''

''کیا اسی وجہ سے تم افسردہ ہو، صدیق؟''

''افسردہ ہونے کے لیے یہی کافی نہیں ہے! لیکن میں نے یہ کب کہا کہ میں افسردہ ہوں؟ ثریا! تم خود یہاں رہ کر دیکھو اور پھر کہو میں افسردہ ہوں! وجہ غالباً یہ ہے ثریا، کہ جب سے تم مجھے چھوڑ گئی ہو، سارے حالات خود مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھنے پڑے ہیں! کوئی اندھا ہی ہندوستان میں رہ کر سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکے گا۔ یہ سب کتنا بھیانک تھا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں ثریا! اگر میں ہندستانی ہوں اور تم پاکستانی ہو!''

''جنم سے تو ہم دونوں ہندستانی ہی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے، یہ کہنا بھی خطرناک ہوگا۔ صدیق! یہ قومیت ہی ہمارے زمانہ کی سب سے خطرناک بیماری ہے۔ میرا یقین ہے اگر ہم خود کو ساری دنیا کے شہری محسوس کرسکیں تو یہ دنیا کتنی پیاری بن سکتی ہے!''

''ثریا! تم کافی بدل گئی ہو۔''

''یہ یقینی بھی نہیں ہے کہ کبھی کوئی بدل ہی نہیں سکتا! اور ویسے بدل جانا اچھی بات بھی نہیں ہے!''

''تم ویسی پاکستانی نہیں ہو، جیسی شروع شروع میں تھیں!''

''تمھارا مطلب ہے میں اتنی نابالغ اب نہیں ہوں! اور اتنی احمق بھی نہیں!''

''پتہ نہیں، میں دراصل کیا کہنا چاہتا تھا!''

''اچھا اب تھوڑی دیر کے لیے مسکراؤ! میں تمھیں مسکراتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔''!

''بیرا! وہی سب ایک بار پھر لے آؤ! جلدی!''

''تمھیں یاد ہے زیادہ پینے سے میں تمھیں منع کیا کرتی تھی!''

''تمھاری تنبیہہ ابھی تک میرے کانوں میں گونجا کرتی ہے ثریا! لیکن اسے اب کتنا عرصہ ہو گیا ہے! لیکن میں اعتراف کر سکتا ہوں کہ اس میں تمھارا بہت سا پیار بھی شامل تھا! اسے میں آج بھی محسوس کرتا ہوں! لیکن تم آج کچھ نہ کہنا، ڈاکٹر ثریا!''

''لیکن صدیق! ہم پھر بھی تو ملیں گے! کئی بار! جب تک میں یہاں ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''صدیق!''

''کہو۔''

''اچھا آؤ اب ہم اپنے اپنے مستقبل کے نام پر پئیں!''

''نہیں تمھارے نام پر اور ہندوستان کے نام پر! چیئرز!''

''کیوں نہیں؟ اسی ملک کے عدم تشدد اور امن کے نظریات کے ساتھ ساری دنیا کا مستقبل وابستہ ہے! آخری امیدیں!''

''لیکن صدیق! آج کیا ہم یہی باتیں کرتے رہیں گے؟''

''نہیں، لیکن موضوع بدلنے سے پہلے ڈاکٹر ثریا! میں ایک بات کہہ دوں! تم پاکستانی ہو!''

''میں پاکستانی نہیں ہوں صدیق!''

''لیکن تم یہاں سے پاکستان ہی گئی تھیں! وہاں کئی سال تک رہی ہو!''

''ہاں دس سال! لیکن میں وہاں کی شہری نہیں ہوں!''

''کیا مطلب''!

''نہیں۔اس بات کو کوئی نہیں جانتا! کسی اور کو بتانا بھی نہیں، صدیق! میں بریٹین کی شہری ہوں۔لیکن میں یہیں پیدا ہوئی تھی، مرنا بھی یہیں چاہتی ہوں!۔صدیق میری طرف اس طرح مت دیکھو!''

''آئی ایم سوری ثریا! لیکن یہ سب مذاق معلوم ہوتا ہے! تم ہمیشہ شریر رہی ہو! اچھا یہ بتاؤ، تم اخبارات پڑھتی رہتی ہو؟''

''ہاں بالکل! کتابیں بھی۔ میں کئی لائبریریوں کی ممبر بھی ہوں، روزانہ شام کو ٹی وی بھی دیکھتی ہوں اور کبھی کبھی یونیورسٹی کی قید سے آزاد ہو کر تھیٹر وغیرہ بھی چلی جاتی ہوں تم نے مجھے سمجھا کیا ہے صدیق!''

''اپنے گذشتہ دور کی ایک شریر لڑکی!''

''صدیق! اب مسکراؤ، وہی اچھا معلو ہوگا۔لیکن تمھارا ہاتھ ٹھنڈا کیوں ہے؟ تم میرے ساتھ بیٹھ کر بھی نروس نہ ہو سکے! جیسا کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے خود کو محسوس کیا تھا میں تم سے اب اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں، جتنا کچھ سوچ کر آئی تھی۔صدیق! پہلے اپنے متعلق بتاؤ۔ہمیں پولیٹکس پر گفتگو نہ کرنی چاہیے۔کم سے کم آج تو نہیں۔اچھا یہ بتاؤ تمھاری بیوی کیسی ہے؟ کیا میں اسے پسند کر سکوں گی؟ کیا وہ تم سے لمبی ہے؟ گوری بھی ہے؟ ہندستانی عورتوں کی طرح دلکش بھی! تم نے شادی کب کی صدیق؟''

''میں نے شادی نہیں کی ابھی تک ثریا! میں جانتا تھا یہ سن کر تم حیران ضرور ہو جاؤ گی اسی لیے تم میرے گھر بھی نہیں آنا چاہتی تھیں! مجھ سے ملنے کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا! کچھ اپنے بارے میں بھی بتاؤ۔تم نے شادی کر لی؟ وہ کون خوش نصیب ہے، کیا کرتا ہے؟''

''صدیق! چھ سال ہوئے ہم نے شادی کی۔ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔پانچ سال کا اس کا نام ایشو ہے! حیران کیوں ہو رہے! کیا یہ سچ مچ تمھیں معلوم نہ تھا۔''

''نہیں مجھے بالکل معلوم نہ تھا ثریا!''''ہم نے ایک مدت سے خط و کتابت بھی تو نہیں ہے!''

''ہاں یہ بات سچ ہے۔تمھارا آخری خط مجھے پیرس سے ملا تھا جون میں۔دس سال پہلے!''

''تم یہ سب کیسے یاد رکھتے ہوئے ہو صدیق! تاریخ تک بتا دیتے ہو!''

''یقیناً! میرے پاس تمھارے سارے خطوط موجود ہیں ثریا! دو درجن! ان کی عبارت تک مجھے زبانی یاد ہے۔ وہ بہت ہی پیارے خطوط ہیں! انھیں پڑھ کر میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا تم رائٹر بنو گی!''

''اچھا! میں خود تو رائٹر نہیں بنی لیکن ایک ناولسٹ کے ساتھ شادی ضرور کر لی ہے! وہ ساؤتھ انڈین ہے۔ اکشئے کمار مارکنڈے، میں نے تمھیں لکھا تھا!''

''تم نے صرف یہ لکھا تھا، میں آئندہ تمھیں خط لکھنا بند کر دوں! کیونکہ تم اب مجھے جواب نہ دے سکو گی۔ اگرچہ تم مجھے کبھی بھول نہ سکو گی! اور تم بھولی بھی نہیں سچ مچ! کیوں ثریا!''

جب اس نے مجھے آخری خط لکھا تھا تو میں سوچتی تھی، اس کے ساتھ یہ سلسلہ بھی کیسے توڑوں؟ میں اب اس کے لیے کیا کر سکوں گی! لیکن صدیق کو اب اور نہ پینی چاہیے۔ مجھے معلوم نہ تھا وہ اتنی پی جائے گا۔''

''ہاں صدیق! میں واقعی تمھیں نہیں بھلا سکی! ایسا کر بھی کیسے سکتی تھی؟''

ثریا! تمھارے منہ سے یہ بات سن کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ مجھے! میرے قریب آ جاؤ! لیکن یہ تم نے اپنی آنکھوں کو کیسے نقصان پہنچا لیا! عینک تو تم نے کبھی نہیں لگائی تھی! تمھاری آنکھیں کتنی خوب صورت تھیں!''

''کہو ثریا!''

''کچھ نہیں!''

''ثریا! یاد ہے، ہم ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے تھے! فرطِ محبت سے کبھی کبھی میں تمھارا ہاتھ چوم لیا کرتا تھا!''

مجھے سب یاد ہے۔ لیکن اسے دہرانا نامناسب ہوگا! ایسا نہ بھی ہو، تب بھی تو نامناسب ہوگا! یہ کیسی محبت ہے! اُف خدایا! پتہ نہیں وہ اور کیا کیا نہ کہہ جائے گا!''

''ثریا! آج میرے ہونٹ اتنے زیادہ خشک کیوں ہیں؟''

''یہ پیاس تمھیں کہاں سے مل گئی صدیق! ازلی پیاس ہے یہ تو!''

''تم مجھے باتوں میں ٹال رہی ہو! اپنی خوب صورت باتوں میں!''

''نہیں ہرگز نہیں!''

''یہ پیاس تم ہی نے مجھے دی ہے! بے شک تم ہی نے تو!''

''یہ سنتے ہوئے کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے! بے حد رومان ٹک!''

''تم دنیا کی سب سے اچھی لڑکی تھیں! ہمیشہ اچھی رہی ہو! اب بھی اچھی ہو۔!''

''لیکن اب تم پینا بند کر دو صدیق! دیکھو میں نے سب ختم کر لی!''

''لیکن میری تو ابھی باقی ہے۔ ذرا میرا سگریٹ سلگا دو! خود ہی سلگا کر میرے ہونٹوں میں دے دو!''

''اچھا سلگائے دیتی ہوں۔ تم اب اٹھارہ سال کے بچے تو نہیں رہے! یہ سمجھ لو کسی بات کے لیے میں ذمہ دار نہ ہوں گی!''

''تم فکر مت کرو ثریا! میرا خیال ہے میں نے ساری زندگی خود ہی اپنا خیال رکھا ہے اور کسی نے بھی نہیں۔ آئندہ ایسا بھی کر سکتا ہوں۔ ویٹر؟ کی کھمکو! ڈاکٹر، رائٹر، لیکچرر، نروس ڈی زیڈز میں اسپشلٹ! بولتی کیوں نہیں ہو؟ اپنے چھوٹے قد کے پیارے پیارے سابق محبوب کے ساتھ باتیں کرو نا!''

''ثریا! تمھیں بتاؤں، میں کیا کرتا ہوں؟''

''اوہ خدا! یہ سب سنتے سنتے تو پھر ایک عرصہ گزر جائے گا!

''صدیق!''

''بولو ثریا!''

تم اتنے زیادہ خوش نظر نہیں آتے ہو! کیا تم خوش نہیں رہتے صدیق؟''

''اس سوال کا جواب دینا اتنا آسان نہیں ہے ثریا! خوشی کا لفظ میں آج کل استعمال ہی نہیں کیا کرتا!''

''یہ کیا کہہ رہے ہو صدیق! بات کیا ہے؟''

''ثریا! تم جانتی ہو، ہمارے ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی! اس میں میرے تین قریبی دوست مارے گئے۔ جن کے ساتھ میں پڑھتا رہا تھا۔ وہ معمولی جنگ نہیں تھی اگرچہ اتنی بڑی بھی نہ تھی، لیکن اس کے اثرات کتنے گہرے ہیں! ابھی تک محسوس ہوتے ہیں۔ ہر سطح پر،

اقتصادی، تہذیبی، سیاسی سطح پر تو تکلیف دہ ہیں ہی!''

''لیکن اب تو امن ہے! کوئی جنگ نہیں نا صدیق! پاکستان بھی اپنے زخموں کو بیٹھا چاٹ رہا ہے اور ہندوستان بھی!''

''یہ جنگ ہم نے پاکستان سے تھوڑی لڑی تھی!''

معلوم ہوتا ہے کہ لینا نے صدیق کے ساتھ کافی اچھا وقت گذارا ہے۔ مرنہ جاتی تو شاید صدیق مجھے بھول چکا ہوتا! اُف میں میں کتنی کمینی ہو رہی ہوں! میرے دل میں رشک پیدا ہو رہا ہے! لیکن صدیق کو اب اور نہ پینی چاہیے۔ اسے اب کھانا کھالینا چاہیے۔ نہیں تو کچھ دیر بعد وہ میز کے نیچے لڑھک جائے گا۔

''صدیق! ایک بات مانو گے؟''

''ہر بات مانوں گا! کہو تو!''

''اب کچھ کھالو۔ سوچواڑھائی بجنے والے ہیں اور مجھے ایک گھنٹے بعد میڈیکل کالج بھی پہنچنا ہے۔!''

''ثریا! تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ گی! آج اتوار ہے ثریا! گھر پر بھی ایک بوتل ہے۔ میں نے تمھارا فون پاتے ہی منگوالی تھی۔ سوچا تمھیں گھر لے جاؤں گا، وہیں باتیں کریں گے بہت اطمینان سے، تنہائی میں۔ وہاں مسز گورونام ہیں، ان کے بچے اور بچیاں بھی! وہ سب تمھارے منتظر ہوں گے! اس تمام عرصے میں وہ تمھارا انتظار کرتے رہے ہیں۔ میں جبھی سے ان کے گھر میں رہ رہا ہوں۔ مسز گورونام کے پاس ایک کیمرہ بھی ہے وہ میرے لیے تمھاری ایک تصویر بھی کھینچے گی۔''

''اوہ خدا!''

''وہ بہت اچھی ہے ثریا! مسز گورونام میرے لیے ماں سے بڑھ کر ہے۔ تم بھی اسے پسند کرو گی۔ تمھارے چلے جانے کے بعد میں ایسی عورت کے گھر میں سکون پا سکتا تھا۔ وہ تمھارے بارے میں ہر بات جانتی ہے۔ اس کے سارے بچے اور بچیاں تمھیں جانتی ہیں۔ ثریا! تمھیں معلوم ہے آج مسز گورونام اور ستیندر اور بلونت اور من جیت نے کیا کیا! مجھے نہیں بتانا چاہیے! لیکن بتائے بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔ انھوں نے مجھے سنبھال سنبھال لیا، جب میں تمھاری کال کے بعد اموشنل ہوا تھا! خوشی سے بالکل پاگل ہی! وہ لوگ مجھے پکڑ کر میڑھیوں سے نیچے لے آئے اور ٹیکسی

میں لاکر بٹھادیا۔ میں اس قدر اموشنل تھا کہ مجھ سے چلنا ہی مشکل ہو گیا ثریا!''

صدیق خاموش نہ ہوا تو اس پر دورہ پڑ جائے گا! اوہ خدا!

''صدیق! چکن کری کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کچھ مچھلی منگالیں اور آملیٹ بھی! اس کے بعد تم مجھے سب بتا دینا! تم میرے بعد کیا کیا کرتے رہے؟ سیلز ٹیکس میں کب تک کام کیا؟''

''میں ابھی تک وہیں ہوں ثریا!''

''ابھی تک!''

''ہاں سترہ سال سے وہیں۔ اب تو خاصی تنخواہ مل جاتی ہے۔ ساتھ آٹھ سو تک! انھوں نے مجھے اب افسر بنا دیا ہے۔!''

''ویری گڈ! یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے! لیکن اب تم ذرا مینو پر بھی تو نگاہ ڈالو نا، صدیق! اب زیادہ وقت نہیں ہے ڈیئر!''

''تمھارے پاس کچھ رقم ہے نا ثریا؟''

ہاں بہت ہے، اس کی فکر مت کرو!''

''اچھا تب میں ایک بہت اچھی چیز کا آرڈر دے رہا ہوں۔ اس بار میں امپورٹڈ وہسکی بھی مل جاتی ہے۔ بیرا! دو بڑے مارٹنی! فوراً!''

''نہیں نہیں میرے لیے ہرگز نہیں''

''اچھا اچھا! دونوں میرے لیے ہی آنے دو! آج میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا دن منا رہا ہوں!''

''خاموش کیوں ہو گئی ہوں! ڈاکٹر ثریا مارکنڈے بولو نا! کچھ نا کچھ کہتی ہی رہو!

''اچھا صدیق بتاؤ، تم شام کو دفتر سے نکلنے کے بعد کیا کرتے ہو؟''

''کتنا احمقانہ سوال کیا ہے میں نے!''

شام کو؟ ثریا سنو! میں ساڑھے پانچ بجے تک کام کرتا ہوں۔ خوب جم کر! سارا دن کاروباری لوگ میرا مغز چاٹا کرتے ہیں۔ اپنے بہی کھاتے لے کر میری میز کو گھیرے رہتے ہیں۔ اپنے اپنے وکیلوں کو ساتھ لے کر آتے ہیں۔ میں اپنی جاب کو خوب جانتا ہوں۔ ان سے نپٹنا بھی

خوب آ گیا ہے۔ ان کے پاس جھوٹ کتنا ہوتا ہے اور سچ کتنا! اپنے فیصلے لکھ کر میں سیدھے گھر چلا جاتا ہوں۔ نہاتا ہوں، کپڑے بدلتا ہوں۔ ساڑھے چھ سات تک مسز گورونام اور ان کے بچوں کے ساتھ گپ لڑاتا ہوں، اس کے بعد کلب، کافی ہاؤس یا کسی بار کا رخ کرتا ہوں۔ اس کے بعد نو بجے واپس آ جاتا ہوں کیونکہ کھانے پر میرا ہمیشہ انتظار کیا جاتا ہے۔ مسز گورونام ایسی عورت ہے، اس نے دو بار مجھ سے اپنی بڑی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے کہا ہے، لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ تم سمجھتی ہو نا، یہ کتنا مشکل ہے! وہ دو تین مسلم گھرانوں سے بھی میرے لیے پیغام لے کر آئی! لیکن بے سود! رات کو میں اپنے کمرے میں کتابیں یا اخبار پڑھتا ہوں، کافی دیر تک، پھر سونے سے پہلے تمھیں یاد کرتا ہوں ثریا! سچ تم ہی کو! تا کہ مجھے نیند بھی آ جائے اور خواب میں تم سے ملاقات بھی ہو جائے اور صبح سات بجے میں پھر اٹھ جاتا ہوں۔''

میں نے صدیق کے آگے چکن کی پلیٹ بڑھا دی۔ وہ اسے کھاتا کیوں نہیں؟

''سنو صدیق! تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ جیسا کہ مسز گورونام کہتی ہیں۔ دوسرے مذہب میں شادی کر لینے سے زندگی میں ایک نئی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ میں تو ایسا محسوس کر رہی ہوں! جیسے بالکل ایک نئی دنیا میں داخل ہو گئی ہوں!''

''ڈیئر ثریا! میرے سامنے مذہب کی کوئی دیوار نہیں ہے! لیکن تم شادی کے لیے اصرار مت کرو! آئی ایم سوری ڈیئر! میں اب شادی کبھی نہ کروں گا ثریا! میرے پاس سات پیغام آ چکے ہیں۔ لیکن یہ بھی نہ سوچو کہ میں شادی کیوں نہیں کر سکتا۔ میں سات بار شادی کر سکتا تھا، سات بار! بتاؤں کیسے؟ لینا اگروال اور ستیندر کول کے علاوہ علی گڑھ یونیورسٹی کی ڈاکٹر ریحانہ نے مجھے کئی خط لکھے ہیں۔ دو سال تک ہفتے میں دو دو خط! لیکن اب میں کسی کو اپنے اتنا قریب نہ آنے دوں گا کہ مجھے چھو بھی سکیں! یہ میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا چاہیے۔! میں گذشتہ چودہ برس سے اس حقیقت کو جانتا ہوں کہ میں کیا چاہتا ہوں! اس لیے.....اس لیے ثریا میں شادی نہ کروں گا! کبھی نہیں!''

''اوہ! تم تو میرا دل دکھانے لگے!''

''ثریا مارکنڈے! میں تمھارا دل ہی تو دکھانا چاہتا ہوں! چودہ سال سے میں اس کوشش میں تھا کہ ایک دن تمھارا دل ضرور دکھاؤں گا! آج تم یہاں ہو۔ میرے پاس! اوہ! کاش میں ایسا کر سکتا تھا!''

''صدیق! یہ چھری ہاتھ سے رکھ دو!''

ثریا مارکنڈے! ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے کہ آدمی کو اتنا بے رحم بھی بن جانا پڑتا ہے! اور کوئی چارہ ہی نہیں رہ جاتا! میں اپنے آپ کو خوش کیا کروں!''

''مجھے افسوس ہے ثریا! ثریا! میرے ہونٹ کتنے خشک ہو گئے پھر!''

''ایسے برے تو نہ بنو صدیق! تم تو بہت اچھے تھے!''

میں اپنی زندگی میں کبھی برا بن کر نہیں رہا ہوں۔ ثریا! یقین کرو! اچھا بننے کے لیے کچھ بھی خرچ نہیں ہوتا!'' اچھا بننے کے لیے کچھ بھی نہیں خرچ کرنا پڑتا۔ ایسی باتیں جاننے کے لیے آدمی کو ڈاکٹر بننے کی ضرورت نہیں ہوتی!

''ڈیئر صدیق! لاؤ تمھارا ہاتھ تھام لوں! اس کے بعد میں تمھیں بہت ہی نا قابل برداشت بات بتاؤں گی۔ دیکھو صدیق! میں صرف شادی شدہ ہی عورت نہیں، ایک بچے کی ماں بھی ہوں! لیکن میری زندگی بھی ایک بار نہیں بلکہ دو بار بڑی سخت الجھنوں کا شکار ہو چکی ہے۔ میں موجودہ عمر میں۔ جن حالات میں رہ رہی ہوں اب کسی کے لیے بھی کوئی اور خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ تمھارے لیے بھی نہیں! پھر سے اپنا سب کچھ الٹ پلٹ کر کے رکھ دوں! یہ نہیں ہو سکتا! صدیق سنو! اگر مجھے ضروری کام نہ ہوتا تو میں تمھارے ساتھ گھر ضرور چلی جاتی۔ اب جانا ٹھیک نہ ہوگا مجھے نا! کل ہمیشہ آتا ہے! اس کے بعد پھر ایک اور کل! اور ہم دونوں! افسوس ہے کہ ہم دونوں انسان ہی تو ہیں!''

''میں جانتا ہوں ثریا! ایک ہفتہ یا ایک مہینہ کی ملاقاتیں بھی ہمیں مطمئن نہ کر سکیں گی!''

''اوہ خدا!''

ثریا، ثریا میری ڈارلنگ ثریا! میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں!''

ڈاکٹر جو بیماروں کا علاج کیا کرتی ہے، اس کے پاس جواب دینے کے لیے کچھ بھی تو نہیں ہے!

''اب میں کسی اور کے لیے زندہ بھی نہیں رہنا چاہتا ثریا!''

ڈاکٹر جو زخموں کو اچھا کر سکتی ہے، درد کو دور کر سکتی ہے اور مرنے والوں کو چپ بھی کرا سکتی ہے، کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔!

''آج ہم نے کتنا اچھا وقت گزارا ہے! کیوں ثریا؟''

''واقعی بہت اچھا وقت گزارا ہے صدیق! لیکن میں تمھارے لیے فکرمند ہوں اور اپنے وقت کے بارے میں بھی! ڈیئر صدیق، سوا تین بج چکے ہیں۔''

''ثریا مجھ پر ایک احسان کرو! میرے ساتھ ایک جام اور پی لو۔ اپنی سائیڈر کا ہی سہی، جانے سے پہلے ایک ایک اور ہو جائے! یاد ہے ہم پہلے بھی اسی قسم کا ہلکا پھلکا ڈرنک لیا کرتے تھے! ہم تعداد میں بہت زیادہ نہ ہوتے تھے! صرف تین ہی تو، لینا اور میں لیکن وہی دن اور راتیں میری زندگی کا جزو بن گئے تھے۔ بہترین یادگاریں! لیکن وہ اب مجھے کتنے دور بھی معلوم ہوتے ہیں! میلوں دور، سوچ سوچ کر میں حیران رہ جاتا ہوں!''

''ڈیئر! ایک سائیڈر کی بوتل!''

''میری سمجھ میں نہیں آتا، میرے دن کس طرح گزریں گے، میرے پاس زندہ رہنے کے لیے یہی کچھ تھا۔ میں جی سکتا تھا، میں نے کتنی محبت کی ہے! غلامی کی ہے اور پیسہ بچایا ہے۔ بینک میں میرے بیس ہزار جمع ہو چکے ہیں۔ میں نے سوچا تھا اتنے روپوں میں ہم کچھ بھی کر لیں گے۔ میں نے ہمیشہ چاہا، ہمارے تین بچے بھی ہوں گے! صرف تین، میں بچوں سے بہت محبت کرتا ہوں تم بھی کرتی ہو، میں جانتا ہوں۔ یہ بات تم ہی مجھ سے کہا کرتی تھیں! صرف بچے ہی اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ تم نے ہمیشہ کہا تھا، میں خودغرض تھا۔ سچ! میں نے تمھارے بارے میں اس وقت اس طرح کبھی نہ سوچا، اگرچہ اب کام کرنے کے دوران میں نے ہر ہر لمحہ تمھیں یاد کرتے ہوئے گزارا ہے۔ اور میں نے تمھارے علاوہ اور کسی کا خواب بھی نہیں دیکھا ہے! لوگ کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے! آج یہ بات کتنی سچ معلوم ہوتی ہے۔ مجھے کبھی شک بھی نہیں ہوا، میں جو چاہتا ہوں اسے حاصل بھی کر لوں گا! میرا یقین پختہ تھا، میں نے ہر لڑکی کے ساتھ، جس سے میں ملا ہوں تمھارا ہی موازنہ کیا ہے۔ دوسری سب بیوقوف معلوم ہوئیں! وہ لیکچرر خاتون جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، وہ تو کچھ بھی نہیں ہے! اس لیے میں نے کبھی لفٹ ہی نہیں دی اسے! ایک بار میں نے ڈاکٹروں کے میگزین میں تمھارا آرٹیکل دیکھا تھا۔ اس میگزین کو میں ہمیشہ منگاتا رہا ہوں۔ تب سے سالانہ قیمت بھیجتا رہا ہوں، لیکن اس کے بعد پھر تمھارا کوئی آرٹیکل نہ چھپا۔ لیکن تمھارا آرٹیکل دیکھتے ہی میں نے یہ سمجھ لیا تھا، جیسے تم میرے پاس پہنچ گئی ہو! پھر واپس آ گئی ہو، جیسے کبھی کبھی لینا

اگر وال مجھ سے کہا کرتی تھی، ایک دن تم ضرور واپس آ جاؤ گی! میں یہاں کے میڈیکل کالج اور اسپتال کی دوسری لیڈی ڈاکٹروں کی طرف ہمیشہ دیکھتا تھا لیکن غور سے کبھی نہیں ثریا! کیونکہ مجھے یقین تھا میں تمھیں دیکھتے ہی پہچان جاؤں گا کیونکہ میں تمھارا سراپا کبھی بھول نہیں سکتا ایک میل دور سے بھی میں تمھیں پہچان لوں گا، اچھا گلاس اٹھاؤ ثریا مارکنڈے! یہ ہم دونوں کے ماضی کے نام ہے جسے ہم کبھی بھول نہ سکیں گے اور یہ تمھارے مستقبل کے نام بھی ہے تم جو میری محبوبہ ہو!''

''میں جانتی ہوں صدیق! تم دنیا کے بہادر انسانوں میں سے ہو!''

''یہ بل میری طرف کر دو! اس میں میں بھی اپنا حصہ ڈالوں گا کیونکہ میں ہی سارا وقت آرڈر دیتا رہا ہوں۔''

''نہیں صدیق! ایسا نہیں ہو سکتا!''

اچھا ثریا! اب چلتے چلتے میں ایک پیگ اور لے لوں! بس آخری! تا کہ اس کے بعد میں سوچتا رہوں، تمھیں یاد کرتا رہوں۔ خدا حافظ ڈارلنگ! مجھے یاد کر لینا! جب کبھی تمھیں کوئی تکلیف پہنچے! میری کبھی ضرورت پڑ جائے! یا مجھ سے کوئی بات کرنا چاہو! صدیق نعمانی تم سے ہمیشہ محبت کرتا رہے گا! اور تمھاری کوئی بھی خدمت کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہے گا۔''

''صدیق! ایسا محسوس ہو رہا ہے میں کچھ کھو بیٹھی ہوں!''

''وہ میں ہی ہوں جسے تم کھو بیٹھی ثریا! لیکن میں غیر ہوں۔ بھول جاؤ مجھے۔''

''کیا واقعی اب تم ٹھیک ہو؟ چل سکتے ہو نا! لو میرا بازو پکڑ لو!''

''بالکل نہیں! ایک ہندستانی کا یہی تو فخر ہو سکتا ہے! اسے مت چھوؤ!''

''ٹیکسی!''

''اندر چلو صدیق! میں تمھیں راستے میں اتار دوں گی!''

''نہیں ثریا! میں تمھارے راستے سے نہیں جا سکتا! مجھے کوئی جلدی بھی نہیں ہے۔ جلدی کبھی نہیں ہوتی، لیکن تمھیں یقیناً ہو سکتی ہے۔ کیونکہ تم ڈاکٹر ثریا مارکنڈے ہو! جسے مریض بھی دیکھنے ہیں اور کالج میں کوئی پیپر بھی پڑھنا ہے!''

''خدا حافظ ڈیئر صدیق! خدا کے لیے اپنا خیال رکھا کرو!''

ہسٹری شیٹر

جب فلم کا آخری شو ختم ہوا، باہر سخت بارش ہو رہی تھی۔ میں تانگے کی پچھلی سیٹ پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹا ہوا تھانے کی طرف چلا۔ میری خاکی وردی کا کچھ حصہ بھیگ گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے سے کچھ سردی کا بھی احساس ہوا۔ سر نکال کر آسمان کی طرف دیکھا۔ بڑے زور کی بجلی چمک رہی تھی۔ رات بھر بارش ہونے کا امکان تھا۔ تانگے والے سے کہا۔

''پھرایا!''

''جی''

''جلدی کیوں نہیں چلتا تیرا گھوڑا؟''

''حضور اس کی ٹانگیں زخمی ہیں۔ پرسوں کچہری سے لوٹتے وقت پھسل گیا تھا'' مجھے اس کی وضاحت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اُچک کر اگلی سیٹ پر آ بیٹھا۔ مونچھیں سہلائیں۔ چابک ہاتھ میں لے کر گھوڑے کی کمر پر پے در پے چھ وار کر دیے۔ گھوڑا تڑپ کر لڑکھڑایا اور پھر بھاگنے لگا۔ میں نے دیکھا پھرایا بھی اُسی دم تڑپ اٹھا تھا لیکن چپ چاپ پائدان سے لگا سہما ہوا بیٹھا رہا تھا۔

چوڑی خاموش سڑک پر جس کے ایک طرف ریلوے کا یارڈ تھا۔ پستہ قد دیوار تھی اور دوسری طرف موبل آئیل، خراد مشینیں، لوہے کا الم غلم سامان بیچنے والوں کی دُکانیں تھیں، گھوڑے کی اونچی اونچی ٹاپیں گونج رہی تھیں۔ زور زور سے بوندیں پڑنے سے موبل آئیل کے خالی ڈرم

بھی بج رہے تھے۔ میں نے اپنے اندر زور زور سے گانا گانے کی خواہش محسوس کی۔ تانگے والے سے کہا۔

''پھرایا''

''جی''

''پھرایا!!''

''جی حضور فرمایئے''

''اونچا کیوں نہیں بولتا؟''

''فرمایئے نا حضور!''

''تو گانا گا سکتا ہے؟''

وہ چپ ہو گیا۔

''بول!..... ماہیا سنا!''

''میں نے کبھی گایا نہیں حضور!''

''پھر بھی کچھ نہ کچھ سنا.....''

میں نے گھوڑے کی کمر پر ایک وار اور کیا۔ میرا ہاتھ روکنے کے لیے پھرایا کا ہاتھ ذرا سا اٹھا لیکن پھر اپنے آپ گر گیا۔

میں نے گھوڑے کی کمر پر پے در پے پھر چابک برسائی اور گھوڑے کی تیز رفتار سے خوش ہو کر تانگے والے سے کہا..... ''سنا تا کیوں نہیں۔؟''

وہ اپنے بے سرے پن سے بھاری، بے ہنگم اور بے رس آواز میں گانے لگا۔

درداں دی ماری جندڑی علیل اے

سوہنا نہ سُنداوکھاں دی اپیل اے!

یکا یک میں نے تانگا روک لیا۔ گھوڑا پھسل گیا۔ میں کود کر نیچے اتر گیا پھرایا سے کہا۔

''گھوڑے کو اٹھا میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ پگڑی کے ایک پلو سے اپنے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ ''جی اچھا'' سڑک کے کنارے شراب کی دکان کھلی ہوئی تھی۔ دروازے کی درازوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹی پڑ رہی تھیں۔

اپنے بید سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر کچھ کھسر پھسر ہوئی پھر آہستہ سے ذرا سا دروازہ کھول کر رحمت نے باہر جھانکا۔

''کیوں بے!'' میں نے اس کے سر پر بید مارا۔ ''دکان کیوں کھول رکھی اس وقت؟''

''جی وہ.....''

''جی وہ کا بچہ.....'' میں نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔

اندر کپڑے کا ایک دکاندار اور میرا ایک ہیڈ کانسٹبل تھا جس نے اٹھ کر مجھے سیلوٹ مارا۔

دین محمد سے میں نے کہا۔

''دین محمد دو بوتلیں لے کر باہر آجا۔''

میں تانگے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ گھوڑا ابھی تک گرا ہوا تھا۔ پھر ایا اس کی زین کھولنے میں لگا ہوا تھا۔ اور رو رو کر اسے پچکار بھی رہا تھا..... ''بیٹا! پتر!! اٹھ! خدا پر بھروسہ رکھ۔ شاباش شیر جوانا''!

دین محمد دو بوتلیں لے کر آ گیا۔ تانگہ چھوڑ کر ہم پیدل چل پڑے۔ تھانہ تھوڑی ہی دور تھا۔ بارش ہلکی ہو گئی تھی۔

''تو یہاں کب آیا تھا دین محمد.....!'' میں نے چلتے چلتے پوچھا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے حضور۔!''

''یہ کپڑے والا کہاں سے مل گیا؟''

''چونگی سے کپڑا بچا کر لے جا رہا تھا'' وہ ہنس کر بولا۔

''پھر؟ کچھ!''

''جی ہاں۔ سب ٹھیک ہے''

''ہوں'' میں نے ایک پتھر کو بوٹ کی ٹھوکر سے اڑایا ''میرے گھر دو مرغ بھجوا دیے تھے؟''

''جی حضور''

''وہ زخمی جو حوالات میں پڑا ہے اس کے وارث پہنچے؟''

''پہنچ گئے حضور''

''کوئی نئی واردات!''

''کوئی بھی نہیں حضور''

تھانے میں پہنچ کر میں نے وردی اتار کر کوارٹر سے تہمد اور کرتہ منگوالیا رات کا ایک بج رہا تھا۔ سونے سے پہلے روزنامچے پر ایک نظر ڈال لینا مناسب سمجھا۔ دین محمد اور چار سپاہی میرے پیچھے کھڑے ہو گئے۔

''کون کون حاضری دے گئے؟''

''فضلا، کریم، دوست محمد اور پیرا'' دین محمد نے بتا دیا۔

یہ سب ہسٹری شیٹر تھے۔ ڈاکے اور قتل ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کئی کئی سال کی سزا پانے کے بعد بھی باز نہیں آئے تھے۔

''اور سیّدا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''وہ نہیں آیا۔ یار محمد کو بھیجا ہوا ہے پتہ لگانے''

''کتنی دیر ہوئی یار محمد کو گئے ہوئے؟'' میں نے غرّا کر پوچھا۔

''کوئی دو گھنٹے حضور۔''

''پھر ابھی تک نہیں لوٹا یار محمد؟ کسی دوسرے کو بھی بھیجا ہوتا پیچھے پیچھے!''

''جی ابھی بھیجتا ہوں۔ اکبر تم چلے جاؤ۔ سیّدے کے گھر جانا سیدھے۔ گھر پر نہ ملے تو اس کی عورت سے پوچھنا۔ ضرورت پڑے تو اسے بھی تھانہ تک لے آنا۔''

''بہت اچھا جناب!''

اکبر بغل میں لاٹھی اور ٹارچ لے کر باہر نکل گیا۔

میں دین محمد کو سیّدے کے بارے میں ضروری ہدایات دے کر کوارٹر میں سونے کے لیے چلا گیا۔ لیکن نیند میری آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ سیّدے کا آج کی رات تھانے میں حاضری دینے کے لیے نہ پہنچنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اگرچہ کئی برسوں سے اس نے کوئی واردات نہیں کی تھی۔ جب سے اس نے شرفو سے نکاح پڑھایا تھا۔ اس کے بعد وہ جیسے بالکل بدل گیا تھا۔ وہ پہلا سا سیّدا رہا ہی نہیں تھا جس نے بارہا جیل کی دیوار پھاند کر خود کو رہا کرا لیا تھا، درمیانہ، قد، گٹھا ہوا جسم، پھڑکتی ہوئی مچھلیاں، کانوں کے پیچھے لمبے لمبے گھنگھریالے بال، سخت بانسے کی نوکدار

ناک کے نیچے مڑی ہوئی مونچھیں، آنکھیں ایسی تیز اور خوفناک کہ کمزور دل تو صرف ایک جھلک دیکھ کر اپنا سب کچھ نکال کر آگے دھر دیں۔ ریلوے مال گودام کی چھت توڑ کر کپڑا چرانے پر کئی بار دو دو تین تین سال کی سزا پائی تھی۔ آخری بار ایک ڈکیتی میں ران پر گولی کھائی تھی۔ جیل کے اسپتال میں پڑے پڑے بھاگ نکلنے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ رات کو دریا پار کرتے ہوئے دوسری ران پر گولی کھائی اور پکڑا گیا۔ تین سال کے بعد جیل سے نکلا تو آتے ہی خان محمد کی عورت کو دل دے بیٹھا۔ کتنا عرصہ خان محمد کے پیچھے اِس بات کے لیے پڑا رہا کہ وہ اپنی عورت کو طلاق دے دے۔ جب وہ نہیں مانا تو ایک دن شرفو کو اغوا کر لیا۔ لوگوں کا کہنا صحیح تھا اگر شرفو کی مرضی نہ ہوتی وہ اسے گھر سے زندہ باہر نہیں لے جا سکتا تھا۔ اپنے علاقہ کی وہ واحد مغرور حسین عورت تھی۔ سرو قد، سرخ و سفید رنگ، بڑی بڑی شوخ اور سیاہ آنکھیں، گھٹنوں تک پہنچنے والے سیاہ ریشمی بال جن کی وہ کئی کئی مینڈھیاں بنا کر سر کا تاج سجاتی تھی۔ چاندی کی پازیبیں پہن کر چھن چھن کرتی ہوئی کسی راستے سے نکل جاتی تو دیکھنے والے دل تھام کر رہ جاتے۔ شعر اور دوہے کہتے۔ ماہیا اور چھلا الاپتے۔ اس کی خاطر لوگ شاعر بھی بنے اور مودائی بھی۔ اس کی خاطر دوستوں اور یاروں میں کتنی دشمنیاں پڑیں۔ رقابت نے دو قتل بھی کرائے۔ باپ کچہری کا معمولی کارندہ تھا۔ چاہتا تو اسے کسی بڑے سے بڑے افسر سے بیاہ کر اپنی غریبی اور ذلت کے زنجیر کاٹ سکتا تھا۔ لیکن غیرت نے گوارا نہ کیا کہ بعد میں کسی سے دو بول سنتا۔ ایک دن چپکے سے بیٹی کا خان محمد سے نکاح پڑھا دیا۔ خان محمد بھی اپنے ماموں کی باتوں میں آ گیا تھا ورنہ اس نے اس حسین آفت کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ بالآخر شرفو سیّدے کے ہاتھ لگی۔ اس نے اس کی خاطر مقدمہ لڑا۔ خان محمد کے آگے ناک رگڑی۔ اور جب اسے حاصل کر لیا پھر بالکل سدھایا ہوا گھوڑا بن گیا۔ ڈاکہ زنی سے توبہ کر لی۔ صبح سے شام تک منڈی میں کمر پر اناج کی بوریاں ڈھوتا جو اڈھائی روپے مل جاتے لے کر گھر آ جاتا۔ دو لڑکیاں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ اب اس سے ڈاکے کی قطعی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن وہ کافی عرصہ سے اس طرح رات کو غائب بھی تو نہیں ہوا تھا۔ ایسی سخت اندھیری اور بادلوں سے گھری ہوئی راتیں ڈاکے اور نقب زنی کے لیے بہت موزوں ہوتی ہیں۔

میں کتنی دیر تک چارپائی پر پڑا پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ میرا خدشہ غلط نہیں تھا۔ میں اٹھ کر تھانے میں جانے والا ہی تھا کہ دین محمد کی آواز سنائی دی اور اس نے بتایا کہ اکبر اور یار محمد دونو

سیّدے کو ڈھونڈنے میں ناکام رہے تھے۔ مجبور ہو کر اس کی عورت کو تھانے میں لے آئے تھے۔

میں کرتے کے بٹن بند کرتے ہوئے تھانے میں آ بیٹھا۔ اور سب سپاہیوں کو بلا کر شہر کے کونے کونے میں بھجوا دیا۔ کہہ دیا لوگوں کو جگا کر خبردار کر دیں۔ اور سیّدا جہاں بھی مل جائے اسے گھسیٹ کر یہاں تک لائیں۔

شرفو نے یہ حکم سنا تو چیخ کر بولی..... ''ایسا ظلم نہ کرو سرکار! خدا تمھارا رزق قائم رکھے حاکم! وہ اب ایسا کام نہیں کر سکتا۔ میں رسول کی قسم کھا کر کہتی ہوں''

''چپ''! گالی میرے لبوں تک آ کر رک گئی۔ میں نے دیکھا۔ شرفو اب چار سال پہلے کی حسین و جمیل قاتل نہیں رہی تھی۔ اس کا چہرہ سوکھ گیا تھا۔ بالوں کی خوب صورتی فنا ہو چکی تھی۔ جسم کے ساتھ دونوں بچیوں کو چپکائے خاوند کے لیے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ میں نے اسے ایک طرف چپ چاپ بیٹھ جانے کے لیے کہا اور حقہ گڑگڑانے لگا جو دین محمد نے بھر کر میرے سامنے رکھ دیا تھا۔

جوں جوں سیّدے کی کھوج لگنے میں دیر ہو رہی تھی میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ صبح پانچ بجے جب ہر طرف روشنی پھیل گئی تو یار محمد اور اکبر سیّدے کو ساتھ لے کر تھانے میں حاضر ہو گئے۔ سیّدے کے ایک ہاتھ میں لاٹھی اور دوسرے میں کپڑے کی گیلی پوٹلی تھی۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ گالیوں کی ایک لمبی بوچھار کے بعد دین محمد سے کہا اسے زمین پر لٹا کر جوتے مار مار کر ادھ موا کر دے۔ دین محمد نے ایسا ہی کیا۔ سیّدا خدا کا واسطہ دے دے کر کہتا رہا۔

''میری بات سن لو سرکار! میں نے چوری نہیں کی ہے۔ قسم خدا کی! میری ایک بات سن لو حاکم!'' ساتھ ساتھ شرفو اور اس کی بچیوں کی چیخیں بھی سنائی دیتی رہیں۔

جب اسے میرے سپاہی مارتے مارتے تھک گئے۔ اور سیّدے کا سارا جسم جگہ جگہ سے اُدھڑ کر سوج گیا اور خون بہنے لگا تو میں نے اس کی پٹائی روک دی اور پھر بڑے اطمینان سے پوچھا۔

''اب بتا کہاں تھا رات بھر! اور دیکھ جھوٹ مت بولنا ورنہ دوسرے سپاہی بلا کر پھر ایک گھنٹہ تک ایسی مار کھلاؤں گا۔''

وہ سر جھکا کر لٹکتے ہوئے لمبے لمبے بالوں سے کیچڑ اور مٹی پونچھنے لگا۔ اس کا چہرہ مار کھا

کھا کر بہت خوفناک ہو گیا تھا۔ بیوی بچوں کی موجودگی نے اسے آبدیدہ کر دیا۔ جھکی جھکی مونچھوں کے نیچے بڑبڑایا۔'' آپ نے بڑا ظلم کیا ہے سرکار! خدا گواہ ہے! خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ آپ نے بہت ظلم کیا ہے۔''

''اب کچھ منہ سے بکے گا یا مار کھائے گا؟ دین محمد نے اسے پیر سے چھو کر کہا۔

''میں نے پہلے بھی کہا ہے۔ اب بھی کہتا ہوں میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کچھ نہیں کیا۔ قسم لے لو۔ بڑی سے بڑی۔''

''رات کو گھر سے کہاں غائب ہو گیا تھا؟ بتاتا کیوں نہیں؟''

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ آہستہ سے لنگڑاتا ہوا اٹھا۔ ایک طرف پڑی ہوئی لاٹھی اور پوٹلی اٹھا کر بولا..... حضور یہ سچ ہے ایسی اندھیری راتوں میں میں نے کتنے ڈاکے مارے ہیں۔ کتنی بار نقب زنی کی ہے۔ کل رات جب میں سو رہا تھا۔ جب زور زور سے بادل گڑگڑائے اور بارش ہونے کے آثار دکھائی دیے تو میرے ہاتھوں میں بڑی کھجلی ہونے لگی۔ بڑے زور کی کھجلی۔ میں خود پر قابو نہیں پا سکا۔ لاٹھی اور آٹا لے کر چپکے سے باہر نکل گیا۔ رات بھر دریا کے کنارے بیٹھا مچھلیاں پکڑتا رہا۔ یقین نہ آئے تو دیکھ لیجیے۔

یہ کہہ کر اس نے پوٹلی کھول دی۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں نیچے زمین پر گر پڑیں۔

مڈنائٹ سن

صبح سویرے ہم لوگ لوکل ٹرین سے نیشنل تھیٹر تک گئے۔ وہاں سے پیدل ساحل سمندر تک جو بہت دور نہیں تھا۔ آسمان پر کالے کالے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش ہونے کا امکان تھا۔ لیکن ہم سب کے پاس چھاتے تھے اور رین کوٹ بھی۔ میں نے کیچڑ سے بچنے کے لیے اینگل شوز بھی پہن رکھے تھے جن کے اندر پتلون کے پائنچے کھوس رکھے تھے۔

ایک سڑک پر ویکم سے کوڑا اٹھانے والی موٹر وین اپنا کام کرتی پھرتی تھی۔ ویکم کی گہری سانسیں کاغذ کا کوئی ننھا سا ٹکڑا بھی نہیں چھوڑتی تھیں۔ کوئی کاغذ اڑ کر فٹ پاتھ پر بھی چلا جاتا تو وین کی ہاتھی جیسی سونڈ وہاں تک پہنچ کر اسے اپنے اندر اتار لیتی تھی۔

کرہل فیری ڈاک پر سٹی ہال کے ایک دیو قامت عریاں بت کے سامنے کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بت ایک جوان اور مضبوط جسم والی عورت کا تھا۔ اس کے سامنے کرہل ایک بچے کی طرح لگا۔ اسی وقت ایک بادل پانی برساتا ہوا ہمارے سروں کے اوپر سے نکل گیا۔ جب تک ہم اپنے اپنے چھاتے کھولتے ہمارے وجود پانی سے تر بہ تر ہو چکے تھے۔ مسز ناتھن نے کھینچ کر اپنے سر سے ریشمی اسکارف اتار لیا اور دونوں ہاتھوں کی خوب صورت مٹھیوں میں لے کر نچوڑنے لگی۔

فیری بوٹ کے اندر بہت سے مسافر موجود تھے۔ کرہل اور ڈاکٹر ناتھن کینٹین سے

ہمارے اور اپنے لیے کافی کے کاغذ کے پیالے لے آئے اور اسی وقت بوٹ جزیرے کے لیے روانہ ہوگئی۔ ساحل اور سٹی ہال کی بلند و بالا عالی شان عمارتوں کا سلسلہ اور اس کے سامنے نصب وہ سارے دیو قامت و عریاں بت بھی جلدی جلدی نظروں سے اوجھل ہونے لگے جنھیں میں کافی کے گھونٹ پیتے پیتے کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ اب میرے سامنے سمندر کی لہریں تھیں جو بوٹ کے ساتھ آ آ کر ٹکراتی تھیں۔

میں جلد ہی کرہل کی باتوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ مجھ سے میری تازہ اسٹڈیز کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے قدیم و جدید نارو بجتین زبانوں کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کیے تو اس کے چہرے پر کچھ ناخوش گواری پیدا ہوگئی۔ وہ بولا۔ ''یہ آپ کا کام نہیں ہے۔ ہمارا اپنا گھر کا جھگڑا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''دنیا کے کسی بھی حصے میں زبانوں کے اختلافات کو تاریخ کے آئینے میں رکھ کر دیکھا جانا چاہیے اور چونکہ ساری زبانوں کی سرحدیں کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے نہ صرف مل جاتی ہیں بلکہ ایک دوسرے کے اندر بھی گھس آتی ہیں اس لیے ہمیں ان کے مسائل سمجھنے کا پورا حق ہے۔ ہمارے اپنے ملک میں دو بڑی زبانوں اردو، ہندی کے درمیان بھی ایسا ہی ایک جھگڑا چل رہا ہے۔ دونوں ہی عوامی ہونے کی دعوے دار ہیں۔ دونوں میں ہزاروں الفاظ مشترک ہیں۔ گرامر بھی دونوں کی ایک ہے۔ صرف رسم الخط الگ الگ ہیں۔

وہ بڑی حیرت سے میری باتیں سنتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا..... ''ہم اگر اپنی لائبریری میں اردو زبان کے مسائل پر آپ کی تقریر رکھیں تو کیا آپ کریں گے؟۔

''کیوں نہیں!''

''ٹھیک ہے، آپ لندن سے واپس آجایئے اس کے بعد دیکھیں گے۔''

پھر وہ مسز ناتھن اور ڈاکٹر ناتھن کے ساتھ میرے لیکچر کے سلسلے میں منصوبہ بنانے لگا اور میں پھر سمندر کی طرف دیکھنے میں محو ہوگیا جس کے آبی جسم پر کئی چھوٹے چھوٹے جزیرے پھوڑوں یا فالتو مانس کی مانند ابھرے ہوئے تھے۔ بوٹ کسی نہ کسی جزیرے پر مسافروں کو اتارنے، چڑھانے کے لیے ذرا رک کر پھر چل پڑتی تھی۔ گھنٹہ بھر کے بعد وہ ایک نسبتاً بڑے جزیرے کے ساحل کے ساتھ جا لگی۔ اور مسافر کشتیوں سے بنے ایک پلیٹ فارم سے ہو کر اس پار

اترنے لگے۔

کرہل بولا..... ''ہمیں بھی یہیں اترنا ہے۔''

اس وقت پھر بارش ہونے لگی۔ ہم چھاتوں کے نیچے نیچے چلتے ہوئے ایک بس میں جا بیٹھے جو وہاں مسافروں کو جانے کے لیے پہلے سے موجود تھی۔ بس جلدی ہی بھر گئی اور پھر گھنے اور اونچے اونچے پیڑوں سے گھری ہوئی سڑک پر دوڑنے لگی۔ جزیرہ خاصا وسیع تھا اور سمندر اب ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ کرہل نے اسی جزیرے پر ایک بہت ہی خوب صورت کاٹج بنوالیا تھا۔ جس میں دو بیڈ روم، ایک ڈرائنگ روم، چھوٹا سا اسٹور، کچن اور باتھ روم تھا۔ آس پاس بھی کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی زمین اسی کی تھی۔ جس پر لاتعداد پیڑ پودے اُگے ہوئے تھے۔ ایک طرف سمندر کا پانی بھی گھسا ہوا تھا لیکن وہ محض ایک تالاب معلوم ہوتا تھا وہاں کچھ لوگ بیٹھے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔

کرہل کی بیوی جوسٹی ہال میں ملازمت کرتی تھی ہمارے استقبال کے لیے ہفتے کی شام کو ہی وہاں چلی آئی تھی۔ اس نے ہمیں لے جا کر سیدھے چائے کی میز پر بٹھا دیا۔ وہ دونوں ہر سنیچر اور اتوار وہیں آ کر گزارتے ہیں۔ ہم لوگ کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر بارش کا لطف بھی اٹھاتے رہے اور چائے کا بھی۔ پھر ٹھیک ایک بجے ماریہ کے یہاں چائے کو چل کھڑے ہوئے۔ اب ہم پانچ تھے۔ کرہل اور ڈاکٹر ناتھن کی بیویاں جنگل میں خودرو کمبیاں توڑ توڑ کر اپنے تھیلوں میں بھرتی گئیں۔ میں رات کو قیام گاہ پر لوٹ کر کمبیوں کے ذائقے کو یاد کر کے دل ہی دل میں خوش ہوتا گیا۔ اب بارش بند ہو گئی تھی اور ہم لوگ پتھریلی اور چکنی پگڈنڈی پر سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ آس پاس کی بے پناہ ہریالی کے سلسلہ وار جھنڈوں کے پیچھے چھوٹے چھوٹے کئی مکان تھے وہی جھونپڑیوں جیسے جن کے دروازے بند تھے۔ کھڑکیوں کے پردے کھنچے ہوئے تھے۔ یہاں انسان بڑے شہروں کے شور و غوغا سے بچنے کو آتا ہے اور تنہائی سے اپنی ذہنی خوراک حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ تنہائی کسی کسی کے لیے عذاب بھی بن جاتی ہے اور کسی کسی کے لیے خدا کی سب سے بڑی نعمت بھی۔

بلائی لا گیٹ میں ایک ایک منزلہ مکان کے دروازے پر ایک تنومند گنجا آدمی کھڑا تھا جو ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ کرہل نے بتایا کہ وہ ماریہ کا شوہر ایکسل ہے۔ ایکسل ہم سے فرداً فرداً

متعارف ہوکر ہمیں مکان کے اندر لے گیا اور آتش دان کے قریب ایک کرسی پر نیم دراز اپنی افسانہ نگار بیوی سے جا کر ملایا۔ میں نے دہکتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں ایک بالکل بجھی بجھی سی بہتر برس کی خاتون کی طرف بڑی حیرت سے دیکھا جس کا اونچا اور چھریرا جسم بے حد پرکشش تھا۔ اس کے سر کے بال بالکل سفید تھے اور چہرہ سرخ و سپید۔ کسی قدر لبوترا بھی جس پر فوراً مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں یک بیک روشنی کی ایک ایسی دلآویز چمک پیدا ہوگئی کہ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ہم سب سے اٹھ کر ملی اور میرے انڈیا سے آنے والی خبر سن کر تو وہ میرا ہاتھ کتنے لمحوں تک بڑی مضبوطی سے تھامے کھڑی رہی۔ اس کی زبان جیسے اچانک گنگ ہوگئی تھی اور آنکھوں میں آنسو بھی تیرنے لگے تھے۔

اس نے مجھ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا..... ''کئی سال ہوئے افریقہ سے بھی ایک رائٹر آیا تھا۔ وہ ہمارے پاس ایک ہفتہ ٹھہرا تھا اور پھر میرے درد کو بڑھا کر واپس چلا گیا تھا۔''

کچھ لمحے خاموش رہ کر اس نے کہا..... ''اجنبیوں سے مل کر مجھے ہمیشہ بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے میں ہمیشہ ان کا انتظار کرتی رہتی ہوں۔''

اس کے آنسو چھلک پڑے اور اس کا شوہر دوسرے مہمانوں کو ایک اور کمرے میں بٹھا کر ہمارے پاس واپس آ گیا۔ بولا..... ''میری بیوی بہت اچھی انگریزی نہیں جانتی لیکن میں آپ کی مدد کروں گا۔''

میں نے ماریہ کو بازو کا سہارا دے کر اندر لے جاتے ہوئے کہا..... ''یہ جس زبان میں کچھ بھی کہے گی میں سمجھ جاؤں گا۔ اس کی آنکھوں کی ہی زبان بہت آسان معلوم ہوتی ہے۔''

ان کا دوسرا بڑا کمرہ کتابوں، رسالوں، تصویروں اور قسم قسم کی مورتیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ہی چھت کے نیچے ڈائننگ ٹیبل، رائٹنگ ٹیبل اور آرام کرنے کے لیے کئی صوفے پڑے تھے۔ پھر بھی اتنی جگہ باقی تھی کہ بڑے آرام سے ادھر ادھر گھوما پھرا جا سکتا تھا۔ اس جگہ نے مجھے آزادی سے سوچنے اور لکھنے کا عجیب سا احساس دیا۔ ماریہ، ایکسل اور میں کمرے کے عین وسط میں کھڑے تھے۔ ماریہ نے سگریٹ سلگالی تھی اور مندی مندی مگر مسرور مسرور آنکھوں سے اپنی ان کتابوں کی طرف دیکھ رہی تھی جو اس کا خاوند ایک ایک کر کے مجھے دکھاتا جا رہا تھا۔ افسانے، ناول، ڈرامے، انشائیے، یادداشتیں وغیرہ۔ اس کے پیچھے دیوار پر اس کی جوانی کے زمانے کا ایک بہت ہی شاندار

پورٹریٹ ٹنگا ہوا تھا۔ تصویر کو اور اسے دیکھ کر میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ وہ بھی انتہا، یہ بھی انتہا!''

ماریہ نے بتایا..... ''یہ پورٹریٹ میرے ایک مداح قاری نے بنا کر دیا تھا۔''

میں نے کہا..... ''اس نے تم سے عشق بھی ضرور کیا ہوگا!''

وہ میری بات سن کر مسکرا دی۔ میں نے اس پورٹریٹ کو اور قریب سے جا کر دیکھا اور کہا..... ''اتنا خوب صورت پورٹریٹ ایک خوب صورت عشق کا ہی اظہار ہو سکتا ہے!''

اس کے بعد ہم کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔ روایت کے مطابق مومی شمعیں بھی روشن کر دی گئیں۔ کھانے کے دوران گفتگو بھی جاری رہی۔ ماریہ اور ایکسل دونوں مجھ سے ہندوستان کے بارے میں سوالات پوچھتے رہے۔ ہندوستان کی متعدد زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان کا بھی ذکر چھڑ گیا۔ کھانا ختم ہو گیا لیکن باتیں ختم نہ ہوئیں۔ اب ہم صوفوں پر بیٹھے وائن بھی پی رہے تھے اور نہرو، کرشنا مینن، جنتا گورنمنٹ، امریکہ، روس، ہنگری وغیرہ پر بھی گفتگو کر رہے تھے۔ یہ سارے موضوعات ایکسل نے ہی چھیڑے تھے۔ ماریہ بڑے مزے سے سگریٹ پیتی ہوئی ہماری باتیں سنتی رہی۔ بیچ بیچ میں کوئی سوال بھی پوچھ لیتی تھی۔ وہ سگریٹ بہت زیادہ پیتی تھی۔

میں نے اسے بتا دیا۔ ''میں تمھارے افریقی دوست کا وہ مضمون پڑھ چکا ہوں جس میں تمھارے جواں سال شادی شدہ بیٹے کی دردناک موت کا ذکر ہے۔''

اپنے بیٹے کے ذکر پر وہ کہیں دور دیکھنے لگی۔ میلوں دور۔ جواب کئی برسوں میں تبدیل ہو چکے تھے اور اسے اچانک اشک بار ہوتا دیکھ کر میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اور موضوع بدلنے کے لیے کہا..... ''اپنی کوئی کہانی سناؤ۔'' ایکسل فوراً ایک رسالہ اٹھا لایا جس میں اس کی کہانی دی ہسبنڈ، چھپی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

''ماریہ نارتھین میں سنائے گی اور میں ساتھ ساتھ ترجمہ کرتا جاؤں گا''۔

وہ کہانی ایک مظلوم عورت کے بارے میں تھی جو اپنے شرابی شوہر کے ہاتھوں روز پٹتی تھی اور روز ہی گھر چھوڑ دینے کا مصمم ارادہ کر لیتی تھی۔ لیکن جب اسے اپنے آدمی کے لیے کھانا بنا کر رکھنے اور اس کے کپڑے دھونے، اور ٹوٹے ہوئے بٹن لگا دینے کا خیال آتا تھا تو وہاں سے چلی جانے کا ارادہ ترک کر دیتی تھی۔

عورت کی مظلومیت اور ایثار ہر کہیں ایک سا ہے۔ وہ صدیوں سے مرد کی ضروریات کا وسیلہ بنتی آئی ہے۔ ماریہ بھی ایک عورت تھی۔ اس کا آدمی اس کا عاشق معلوم ہوتا تھا۔ اور ایسا لگتا تھا وہ اسے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی دکھی نہیں ہونے دیتا ہوگا۔ لیکن پھر بھی وہ کس قدر دکھی تھی۔ اس کی آنکھیں اور اس کی کہانی ایک سی داستان کہتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

جب ہم چلنے لگے تو اس نے مجھے اپنی ایک تصویر آٹوگراف کے ساتھ دی۔ جس میں وہ ایک پیاری سی بلی کو اپنی گود میں لیے ہوئے اسے چوم رہی تھی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''آج میں نے حقیقی معنوں میں ایک بہت ہی پیاری اور مہربان روح تک پہنچنے کا سفر کیا۔

یہ سن کر اس نے مجھے بڑے پیار سے گلے لگایا اور چوم لیا۔ اب تک میں کتنے غیر ملکی لوگوں سے مل چکا تھا۔ ان ہی کی سرزمین پر..... مرد، عورتیں، شریر مزاج لڑکے اور نوخیز وشوخ لڑکیاں۔ ان کے ساتھ بھی میری بیشتر موضوعات پر باتیں ہوئی تھیں۔ پولکس، تارکین وطن کے مسائل، علم وادب اور جنسیات تک پر، کئی ایک کے ساتھ شرابیں پی تھیں، ڈانس کیا تھا اور جوا کھیلا تھا۔ اور ان کے نزدیک ترین جذباتی لمحات بھی دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن جس قدر طمانیت اور محبت مجھے اس بزرگ خاتون سے مل کر حاصل ہوئی اسے میں بڑی اہمیت دیتا ہوں۔

ماریہ اور ایکسل ہمیں کالج کے گیٹ تک چھوڑنے کے لیے آئے۔ میں نے رخصت ہونے سے پہلے ماریہ کو بتایا۔ میں کچھ روز کے لیے لندن جا رہا ہوں وہاں سے لوٹ کر لیسی بو کے سمینار میں شرکت کروں گا۔ وہاں سارے ہی مقامی ادیب آئیں گے۔ امید ہے تم سے بھی ایک ملاقات اور ہو جائے گی۔!''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب تک میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ گیٹ پر کھڑی ہاتھ ہلاتی رہی۔ ان ہی لمحوں میں بادلوں کے پیچھے جا چھپنے والا مورج بھی پھر سے نکل آیا تھا اور اس کا چہرہ اچانک گلنار سا ہو گیا تھا۔

لندن سے لوٹ کر میں دوسرے ہی دن لیسی بو کے سمینار میں چلا گیا۔ وہاں تیرہ ملکوں کے نمائندہ ادیب اور صحافی پہنچ چکے تھے۔ ہم سب کو اوسلو سے ساٹھ کلومیٹر دور ایک پہاڑی مہمان

سرائے میں الگ الگ کمروں میں ٹھہرایا گیا۔ ہر ایک کمرے میں ایک آرام دہ پلنگ، صوفہ سیٹ، رائٹنگ ٹیبل، ریڈیو، ٹیلی فون، ٹی وی اور باتھ روم تھا۔ تنہا رہنا مجھے اچھا لگا۔ اگرچہ لکڑی سے بنی ہوئی اس عمارت کے نیچے ڈائننگ ہال میں بہت شور تھا۔ سب سے زیادہ شور مچانے والے نارویجین رائٹرز تھے جن کے دو گروپ تھے۔ پروگریسو اور اینٹی پروگریسو۔ اینٹی پروگریسو گروپ کے ادیبوں کو شکایت تھی کہ ان کے بیشتر ممتاز ادیبوں کو سیمنار میں مدعو کیوں نہیں کیا گیا۔ ہم لوگ جو ہندستان، انگلینڈ، آئرلینڈ، ہنگری، افریقہ وغیرہ ممالک سے گئے تھے۔ ان کی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے یا تو بڑی خاموشی سے ان کے پرجوش چہرے تاکتے رہے۔ یا پھر ایک دوسرے سے متعارف ہوتے رہے۔

پولینڈ کے ایک اخبار کی جرنلسٹ لڑکی گرازینا سے میری دوستی وہیں ایک ٹیبل پر ہوگئی تھی۔ وہ لمبی ناک والی دبلے پتلے جسم کی بڑی متحرک لڑکی تھی۔ جس پر انگلینڈ کے ماہنامہ سنگنیچرز کے اڈیٹر کی بھی نظر تھی۔ وہ اسے تین بار اپنی باتوں میں لگا کر میری ٹیبل سے کھسکا کر لے گیا تھا۔ لیکن پہلی ہی شام کو گرازنیا نے میرے کمرے میں آکر شراب پینے کی دعوت قبول کرلی تھی۔ دراصل اسے ہندوستان کے قدیم مذاہب سے بڑی دلچسپی تھی۔ دو ہی پیگ پی لینے کے بعد اس نے بتایا ''میں اس یقین میں بری طرح مبتلا ہوں کہ اگلا جنم ہندوستان میں ہوگا اور میں کسی مندر میں دیوداسی بن کر زندگی گزاروں گی۔

میں نے اسے بہت یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہندوستان میں دیوداسیوں کی قدیم رسم ایک عرصہ ہوا ختم ہو چکی ہے لیکن وہ نہ مانی۔ اور پھر اچانک نشے میں بڑبڑانے لگی۔ ''میں بہت جلدی خودکشی کرلوں گی تاکہ جلد سے جلد دوسرا جنم لے سکوں۔''

میں نے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے میوزک کا ذکر چھیڑ دیا اور جب میں نے ریڈیو پر ڈرم بیسٹرز کی ایک تیز دھن تلاش کر کے اسے ناچنے کی دعوت دی تو اس نے کہا۔

''ٹھہرو، میں تمھیں اپنا ایک سلو ردم کا کیسٹ سناتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی جو اسی گیلری میں تھا۔ جلدی ہی واپس آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹیپ مشین اور تین چار کیسٹ تھے۔ ایک کیسٹ لگا کر وہ اپنے بار بار پھسلتے ہوئے کالے بالوں کو سمیٹنے لگی۔ لیکن اسے اپنے پرس میں کوئی کلپ نہ ملا تو اس نے بالوں کو

پھر سے کھلا چھوڑ دیا اور ناچنے لگی۔

روم بہت دھیما تھا۔ وہ اسی کے مطابق آنکھیں بند کر کے اور اپنے دونوں لمبے بازو گردن کے پیچھے رکھ کر دھیرے دھیرے اسٹیپ لیتی رہی۔ میں اپنے صوفے میں ڈوبا ہوا اس کے جسم کو گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ ایک دو بار اٹھ کر اس کا ساتھ دینے کی کوشش بھی کی لیکن مجھے لطف نہ آیا تو پھر سے گلاس بنانے کے لیے بیٹھ گیا۔ ایک گلاس اس کے لیے بھی بنایا اور اس کے سامنے لے گیا۔ میرے ہاتھ سے گلاس لینے کے بجائے وہ میرے گلے سے لپٹ گئی اور رو رو کر کہنے لگی..... ''کیا ایسا نہیں ہوسکتا میں آج ہی مر جاؤں اسی طرح ناچتے ناچتے .....اور..... روتے روتے!''

میں نے اسے اپنے پاس صوفے پر بٹھا لیا اور اس کے چہرے پر گرے ہوئے بال ہٹا کر پوچھا..... ''تمھیں اپنے بچپن کا کوئی خاص واقعہ یاد ہے، تمھارے ماں باپ کیا کرتے ہیں؟ تم لوگ کتنے بہن بھائی ہو؟''

اس نے کہا..... ''میرا باپ ایک گھڑی ساز تھا۔ اب وہ مر چکا ہے۔ میری ماں بہت خوب صورت ہے لیکن اس پر قطعاً نہیں گئی ہوں۔ تم دیکھتے ہو، میں زیادہ خوب صورت ہرگز نہیں ہوں۔ لیکن میری ماں کو یہ وہم تھا کہ میں ہی اس کی سب سے دلکش اولاد ہوں۔ چار بہن بھائیوں میں سے۔ اور وہ چاہتی تھی کہ میں ایکٹریس بنوں۔ لیکن میں نے جرنلسٹ ہی بننا پسند کیا۔''

اس نے میز پر رکھا ہوا گلاس ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا اور ایک ہی سانس میں پی گئی۔ پھر کہنے لگی..... ''مجھے یاد آتا ہے۔ میں بچپن میں ایک بار اپنے گھر کی کھڑکی سے کود پڑی تھی اور میری ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ پھر کئی مہینے پلاسٹر میں جکڑی ہوئی پڑی رہ گئی۔ مجھے بس یہی ایک واقعہ یاد ہے۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

اس نے اپنے بدن کو ادھر ادھر حرکت دے کر سیدھا کیا۔ پھر جھک کر ہاتھوں سے اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کو چھوا اور بولی..... ''پچھلے تین روز سے میں ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ تھی۔ آئی ہیڈ ٹو مچ سیکس! بہت تھک گئی ہوں لیکن ناچنے کو جی چاہ رہا ہے۔ آج ہم لوگوں کے لیے الاؤ کے گرد ڈانس کا بھی پروگرام رکھا گیا ہے۔ مجھے وہاں ضرور جانا چاہیے۔''

یہ کہہ کر وہ باہر چل دی۔ ''سی یو!'' وہ دروازے پر ذرا سی رک کر بولی مسکرائی اور

غائب ہوگئی۔

اگلے روز خوب بارش ہوئی لیکن سارا دن عالمی سنسر شپ پر مقالات اور بحثوں کی نذر ہوگیا۔ ایک پیپر میں نے بھی انگریزی میں پڑھا تھا۔ ''ہندستان میں اظہار کی آزادی۔'' جس کے نارویجین ترجمے کی سائیکلو اسٹائل کاپیاں ہر شخص کو دے دی گئی تھیں۔ بحثوں ہی سے اکتا کر کچھ لوگ باہر نکل جاتے تھے۔ گرازینا اسپیکنگ ڈیسک کے پاس اپنے سامنے ریڈوائن کا ایک گلاس رکھے بیٹھی تھی اور اپنے میگزین کے لیے نوٹس لینے میں مصروف تھی۔ ایک مقامی روزنامہ کا رپورٹر مغربی جرمنی کی باربرا گنیتی کو میرے پاس بٹھایا گیا تھا تاکہ وہ میری اور اس کی فوٹو اتروا سکے۔ نارتھ ناروے کا ٹیچر سکوگھم اچانک اپنے ٹوتھ برش پر پیسٹ لگا کر باہر جانے لگا لیکن ایک مقرر کی کوئی خاص بات سن کر رک گیا اور تیز تیز لہجے میں اسے جواب دینے لگا تو گرازینا زور سے ہنس پڑی۔ میں نے اسی لمحے وہاں کے گیٹ پر ماریہ کا بوڑھا جسم نمودار ہوتے ہوئے دیکھ لیا اور چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ماریہ اپنے جوتے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے میرے پاس پہنچی تاکہ لکڑی کے فرش پر چلتے وقت آواز نہ پیدا ہو۔ اس نے دوسرے ادیبوں کے ساتھ بس نظروں سے ہی دعا سلام کی اور مجھ سے کہنے لگی..... ''تم جانتے ہو اس سیمینار میں مجھے مدعو نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن میں صرف تم سے ملنے کے لیے آگئی ہوں۔ ایکسل مجھے چھوڑ کر واپس چلا گیا ہے۔''

میں اسے سہارا دے کر باہر لے گیا۔ سیمینار سے میری دلچسپی یوں بھی ختم ہو چکی تھی کہ ساری بحث نارویجین زبان میں ہو رہی تھی۔ میری مترجم نے اگلے روز صبح آنے کا وعدہ کر رکھا تھا اور مجھے یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ اخبارات میں چھپی ہوئی اب تک کی بحثوں کے پورے نوٹس انگریزی میں بنا کر ساتھ لے آئے گی۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ میرے پیپر کے بارے میں کسی نے کیا کہا تھا! ایسے وقت میں ماریہ کا آجانا مجھے اچھا ہی لگا۔ اسے میں کینٹین میں لے گیا۔ ہم دونوں نے گرم گرم کافی پی اور پندرہ روز پہلے اس کے جزیرے والے مکان پر اس کے ساتھ ہوئی ملاقات کو یاد کر کے ہنستے رہے۔

اس نے بتایا، میرے مرحوم بیٹے کی بیوی اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ ایک اتوار گزارنے کے لیے ہمارے پاس آگئی تھی۔ اور بہت خوش تھی۔ ایکسل ان کے ساتھ خوب شراب

پیتا رہا اور رمی کھیلتا رہا۔'' سمینار ختم ہوگیا تو بہت سے لوگ ادھر ہی پہنچنے لگے۔ میں اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے بیڈ پر لٹا دیا اور اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ اپنے لندن کے سفر کے بارے میں وہاں کون کون سی جگہیں دیکھی تھیں، کن کن لوگوں سے ملا تھا۔ ہندستانیوں اور پاکستانیوں سے اور بی بی سی کے دو انٹرویوز میں مجھ سے کون کون دلچسپ سوالات پوچھے گئے تھے۔ پھر مجھے اچانک ایک ڈینش لڑکی ایلس یاد آگئی جس نے میرے ساتھ ہوائی جہاز میں لندن تک سفر کیا تھا اور واپسی پر پھر اوسلو تک سفر کیا تھا۔ اسے ڈینش ہونے کا بڑا غرور تھا۔ دنیا کے ہر بڑے آرٹ اور آرٹسٹ کا رشتہ کسی نہ کسی طرح اپنے ملک ڈنمارک سے ضرور ملا لیتی تھی۔ میں نے اسے چھیڑنا شروع کیا تو وہ پریشان ہوگئی۔ سمجھ گئی میں اس کی زیادہ تر باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتا ہوں۔ یہ سب سن کر ماریہ خوب ہنسی۔

میری باتوں کے دوران سارا وقت میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے رہی۔ اور میری طرف بڑی محبت سے تاکتی بھی رہی۔ میں نے اسے شراب آفر کی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن اس نے اصرار کیا کہ میں اس کے پاس بیٹھا رہوں تو میں نے اس کی کمر میں اپنا بازو حمائل کر دیا اور کہا۔ ''تمھیں اتنی رات گئے واپس نہیں جانا چاہیے۔ اگر ایکسل آئے گا تو میں اسے واپس کر دوں گا۔''

یہ سن کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کتنے لمحوں تک میری طرف مسرور نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں رفتہ رفتہ آنسو بھی تیر آئے۔ جنھیں چھپانے کے لیے اس نے میرے گال کے ساتھ اپنا گال ملا لیا اور بولی..... ''میں نے اسے منع نہیں کیا تھا۔ وہ آئے گا تو کہہ دوں گی واپس چلا جائے۔''!

میں بہتر سالہ خوش نما چہرے والی اس نامور ادیبہ کو اپنے پاس پا کر بہت خوش تھا۔ جو اپنی جوانی میں بے پناہ خوب صورت رہی ہوگی۔ اس پر کتنے لوگ مرمٹے ہوں گے۔ بیٹے کی موت کے غم نے اسے بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس لیے اس کی کہانیوں میں بھی اب بڑا کرب محسوس ہوتا تھا۔

وہ بار بار سگریٹ اور شراب پیتی رہی اور اپنی زندگی کے بارے میں بولتی رہی۔ ''میری ماں ایک جپسی قبیلے کی عورت تھی۔ لوگ اس سے بہت نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اسے ایک جادو گرنی ہی سمجھتے تھے۔ بلکہ ایک چڑیل، جو دوسروں کے بچے اٹھا لے جاتی ہے۔ لوگوں کو تنہا پا کر ان

کے کلیجے چبا جاتی ہے۔ وہ یہ سب نہیں کرتی تھی تب بھی لوگ اسے اپنی آبادیوں کے نزدیک پھٹکنے نہیں دیتے تھے۔ ایک بار اسے بہت پیٹا گیا تھا۔ لوہے کے ڈنڈوں سے اور پتھروں سے۔ وہ ایک جرمن کسان کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔ اس سے راتوں کو چھپ چھپ کر ملنے کے لیے کتنے پہاڑی جنگلوں میں سے ہوکر پہنچ جاتی تھی۔ میں ان ہی دونوں کی مخلوط اولاد ہوں۔ تم نے میری آنکھوں میں شاید غور سے جھانک کر نہیں دیکھا۔ میری دونوں آنکھیں ایک سے رنگ کی نہیں ہیں۔ یہ مکسڈ بلڈ کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے لوگ مجھ سے بھی نفرت کرتے تھے۔ اب بھی نفرت کرتے ہیں۔ اگرچہ میں نے اپنے ملک کے لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ کئی کتابوں پر انعامات بھی لے چکی ہوں۔ لیکن وہ مجھے بھی ایک چڑیل سمجھتے ہیں۔ اگرچہ میں بے حد خوب صورت تھی۔ شاعر مجھ پر نظمیں لکھتے تھے۔ مصور میری تصویریں بناتے تھے لیکن میرے ساتھ کوئی شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ جس مصور کی تم نے بنائی ہوئی تصویر دیکھی تھی وہ مجھ پر جی جان سے فدا تھا لیکن لوگوں کے ڈر سے اس نے میرے ساتھ شادی نہ کی۔ میرا مرحوم بیٹا اس کی نشانی تھی۔ اسے بھی میں نے اپنی ماں اور سوسائٹی سے ملنے والی نفرت ورثے میں دی تھی۔ جسے بھلانے کے لیے وہ بڑی فاسٹ لائف گذار رہا تھا۔ کلبوں میں جاتا تھا، بے تحاشا شراب پیتا تھا اور جوا کھیلتا تھا اور لڑکیوں کے پیچھے بھاگتا تھا۔ کھیل کود کا بھی شوقین تھا۔ موٹر سائیکل ریسیں جیتنے کے لیے وہ کتنے ملکوں کے مقابلے میں شامل ہوا۔ آخر اسی میں اس کی موت ہوگئی۔ وہ زخموں سے چور چور ہوکر چل بسا۔ میں اس کی لاش دیکھنے کے لیے مورچری میں گئی اور اسے اتنی بری حالت میں دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ ایکسل مجھے وہیں مل گیا تھا۔ وہ ایک مدت سے میرا قاری تھا۔ میری تحریروں کا بے پناہ دلدادہ۔ مجھے مرنے سے بچانے کے لیے اس نے میرے ساتھ شادی کرلی۔ اگرچہ عمر میں مجھ سے کافی چھوٹا ہے۔ وہ کئی لحاظ سے ایک اچھا ہسبنڈ ہے۔ میں اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ ان لوگوں سے بھی بڑے اخلاق سے پیش آتا ہے جنھیں میں بے انتہا چاہتی ہوں۔ میں تم سے دوبارہ ملنے کے لیے بیتاب تھی۔ میں نے اس سے کہا مجھے مرنے سے پہلے تم سے ایک بار ضرور ملنا ہے۔ اسی لیے وہ مجھے یہاں لاکر چھوڑ گیا۔''

یہ کہتے کہتے وہ چپ ہوگئی۔ میری طرف گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی مسکرانے لگی۔ میں بھی اس کی آنکھوں میں بالکل ڈوبا ڈوبا سا دیکھ رہا تھا۔ میں نے پہلی بار اس کی دونوں آنکھوں

کے رنگوں کے فرق کو پہچانا۔ ایک سبز رنگ کی تھی، دوسری نیلے اور سبز ملے جلے رنگ کی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں یہ سوچ کر کانپ گیا کیا چڑیلیں ایسی ہی ہوتی ہیں! اس تنہائی میں وہ موقع پا کر میرا بھی کلیجا نوچ کر نہ چبا جائے۔ میں نے اپنے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس کر لیے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ مجھے بے انتہا خوب صورت معلوم ہونے لگی۔ اس نے مجھے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا اور گہرے گہرے سانس لیتی ہوئی کہنے لگی۔

''رام لعل، مجھ سے ڈرو نہیں۔ تم مجھے پہلی نظر میں ہی بہت اچھے لگے۔ میں یوں بھی تم سے اسی محبت سے ملتی کیونکہ تم سات سمندر پار سے مجھ سے ملنے کے لیے آ گئے ہو۔ کیا تم نے کبھی سوچا تھا میں یہاں ایک چھوٹے سے جزیرے پر تمھارا انتظار کر رہی ہوں گی! کتنے برسوں سے! اسی انتظار میں میرے بال سفید ہو چکے ہوں گے! میرا جسم ڈھل گیا ہوگا! تمھیں دینے کے لیے اب میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا ہوگا۔ ! سوائے محبت کے۔''!

اس نے میرے ہونٹوں پر ایک طویل بوسہ دیا۔ جذبے سے بھرپور۔ اور میں نے ایسا محسوس کیا، وہ ایک بوڑھی عورت ہرگز نہیں ہے۔ میرے بدن سے مس ہوتے ہی اس کا جسم بیدار ہو گیا ہے۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے اعضا اور پلپلے گوشت میں اچانک ایک جوان عورت کی سی سختی اور گرمی پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہ وہی خوب صورت عورت ہے جسے دیکھ کر کتنے لوگ آہیں بھرا کرتے تھے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر کچھ بھی نہ دیکھا اور اسے اپنے بازوؤں میں پوری طرح جکڑ لیا اسے بے شمار بوسے دیے اور جب وہ تھک کر بستر پر گر پڑی تو اپنی آنکھیں بند کر کے بولی..... ''بس! یہاں سر رکھ کر سو جاؤ، بچے! میرے سینے پر۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔''

نئی دھرتی پرانے گیت

سائیں داس شام کو چھ بجے گھر لوٹا، تھکا ماندہ اور پریشان، سائیکل ڈیوڑھی میں دیوار کے ساتھ لگا کر اندر آیا۔ برآمدے میں اس کی ادھیڑ بیوی چارپائی پر بیٹھی اپنے آگے ڈھیر سارے شلغم رکھے ایک بڑی چھکور میں کاٹ کاٹ کر ڈالتی جا رہی تھی۔ اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر پہلے تو وہ مسکرا دی، پھر اس کی مغموم صورت دیکھ کر حیران رہ گئی..... بولی، ''خیر تو ہے؟''

سائیں داس ایک لمبی ''ہوں'' کہہ کر ٹائی کی گرہ کھولتا ہوا سیدھا کمرے کے اندر گھستا چلا گیا۔ کوٹ پینٹ اتار کر ایک رنگین تہمد باندھ لیا اور آرام کرسی پر دھنس کر بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی بھی اندر چلی آئی، شلغموں کی چھکور اور چھری اٹھائے ہوئے۔

''بتاتے نہیں، بات کیا ہے؟''

''کوئی بات تھوڑی ہے بھلی لوگ'' اس نے ایک لمبی سانس لے کر کمرے کی پرانی چھت کو گھورا، بوسیدہ، دیمک لگی، لکڑی کی کڑیاں چھت کے بوجھ سے جھکی جھکی سی تھیں۔ کسی بھی لمحے گر بھی سکتی تھیں۔ کمرے کی وسطی دیوار میں سنگ مرمر کا ایک پتھر نصب تھا، جس پر سیاہ حروف میں..... اللہ اکبر، لکھا تھا۔

''آج پھر کلیم آفس کی خاک چھانتا پھرا ہوں، دفتر سے آدھ گھنٹے کی چھٹی لے کر گیا تھا پر وہاں لگ گئے پورے چار گھنٹے۔''

''پھر کچھ ملا مکان کی مرمت کے لیے؟''

''خاک، کہتے ہیں ایک ہفتے کے بعد آؤ۔''

''بتایا نہیں انھیں، سردیوں کی جھڑی لگ گئی تو مکان یہ گر پڑے گا!'' پھر وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔

''اندھیر ہے، نرا اندھیر! اگر ملنے کی امید ہو تو اپنا ہی تھوڑا بہت بیچ باچ ڈالیں۔''

''کیا بھروسہ بھلی لوگ، دفتروں کی کارروائیاں کا، ملتے ملتے دو سال تو لگ ہی جائیں گے! اس کی بیوی پاس پڑے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ دھیرے سے بولی۔

''آج وہ ٹھاکر داس اور اس کی بیوی، دونوں آئے تھے، بیٹے کی شادی کا کارڈ دینے!''

''اچھا''!

''ہاں۔ آپ تو تھے نہیں، میں نے بھی مناسب نہیں سمجھا، کچھ کہنا سننا، کارڈ لے کر رکھ لیا، جانے سرلا نے کہاں رکھ دیا ہے۔!''

اس نے سرلا کو ذرا اونچی آواز میں پکارا، ''سرلا، نی سرلا!!''

ذرا فاصلے سے مترنم آواز سنائی دی۔ ''جی ماتا جی، آتی ہوں۔''

اور پھر پاؤں میں پہنے ہوئے ربڑ سول سلیپروں کی ہلکی ہلکی تھپ تھپ کی آواز پیدا کرتی ہوئی جس میں ایک رقص کا سا ترنم اور نظم تھا، اٹھارہ انیس سال کی، شلوار قمیص اور دوپٹے میں ملبوس ہوئی اس کی طرف بڑھ گئی۔ کرسی کی پشت پر پڑے ہوئے باپ کے کپڑے دیکھے تو انھیں لپک کر اٹھا لیا اور ہنگر میں لا کر دیوار پر لٹکاتی ہوئی ماں سے بولی!

''کہیے نا ماتا جی، کیا کام ہے؟!''

''پتر وہ کارڈ کہاں رکھا ہے ترلوک کی شادی والا؟ آج ہی اس کے ماں باپ دوپہر میں دے گئے تھے۔''

یہاں رکھا تو ہے! وہ دیوار گیر پر رکھی ہوئی ایک تصویر کے پیچھے سے ایک بڑا سا لفافہ نکال کر لے آئی۔

سائیں داس کچھ منٹ تک بڑی خاموشی سے کارڈ پڑھنے میں محو رہ گیا۔ اس کی بیوی شلغم کو دھیرے دھیرے چھیلتی ہوئی بولی۔

''کیا خیال ہے؟ جایئے گا شادی میں۔''

''سچ پوچھو تو، جی تو نہیں چاہتا۔ انھوں نے اب تک ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کارڈ لینا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

یہ کہہ کر سائیں داس نے اپنے سرخ و سفید چہرے کو دونوں ہاتھ رگڑ کر ملا۔ پھر اپنی مہندی سے رنگی ہوئی سرخ مونچھوں کو سہلایا۔ پھر وہ ٹھوڑی کے نیچے بلا وجہ کھجانے لگا۔ اس کی اونچے بانسے کی ناک اور سختی سے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے اس کی اندرونی خفگی کا ایک واضح اظہار ہو رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ اسی طرح تھکی تھکی اور اکتاہٹ بھری آواز میں بولا۔ ''اسی مکان کا قصہ لے لو۔ ہماری الاٹمنٹ کینسل کرانے کی ٹھاکر داس نے کتنی کوشش کی، سر توڑ کوشش کی نا! پر کامیاب نہ ہو پایا۔ اس نے ہمارے ساتھ حاسدانہ رویہ نہ اپنایا ہوتا، تو آج ہم ایک دوسرے کے کتنے قریب ہوتے۔ یاد ہے تم ہی نے ایک بار مجھ سے اپنی سرلا اور ان کے ترلوک کا ذکر کیا تھا!''

سرلا اپنا نام سن کر دھیرے سے باہر چل دی۔ سر جھکا کر۔ اب اس کا ربڑ سول سرخ سلیپروں کا پہلا سا مترنم آہنگ سنائی نہ دیا۔ وہ مایوسی میں ڈوبی ہوئی ایک محتاط سی چال تھی بس!

''ہاں!!۔ وہ تو تب کی بات ہے جب رام دیوان آٹھوں پہر میرے گھر میں گھسی رہتی تھی جب دیکھو، کوئی نہ کوئی کام لیے چلی آ رہی ہے۔ بہن یہ بات ہے، بہن وہ بات ہے! اسے تو سوئی میں تاگا ڈالنا ہوتا تو مجھ سے صلاح لیے بغیر ایسا نہیں کرتی تھی۔ دوڑتی بھاگتی، بیچ کی دیوار اولانگھ کر جھپاک سے میرے پاس پہنچ جاتی تھی۔ اب وہی پڑوس ہے، وہی رام دیوان ہے اور میں بھی وہی ہوں۔ لیکن بیچ کی دیوار اونچی ہو گئی ہے، اور مہینوں بیت جاتے ہیں ایک دوسرے کی شکل دیکھے ہوئے۔ انھوں نے حضرت گنج میں دکان کیا کھول لی، دماغ ہی آسمان پر جا پہنچا۔

یہ کہہ کر سائیں داس کی بیوی نے جلدی جلدی ایک شلغم کی کئی ڈلیاں کاٹ ڈالیں۔ بالکل بے خیالی میں اور سائیں داس بولا۔

''روپیہ محبت کا دشمن ہوتا ہے۔ بھلی لوگ۔ روپیہ پا کر تو آدمی قریبی سے قریبی رشتہ تک کو بھول جاتا ہے۔ ایک ہی ماں باپ کے جائے ایک دوسرے کے دیری بن جاتے ہیں۔ ہمارا تو بس ایک ہی شہر کا ناطہ تھا۔ پاکستان سے نکل کر یہاں پہنچے تو اتفاق سے پڑوسی بن گئے۔''

''پر ہم لوگ بھی کتنے عجیب ہیں۔ اس شہر کی کئی لاکھ آبادی میں اپنی طرف کے مشکل

سے تیس چالیس گھر ہوں گے۔ اس پر بھی آپس میں نہیں مل بیٹھتے! ایک دوسرے کے ساتھ نام کو بھی ہمدردی نہیں رہ گئی ہے۔''

یہ کہہ کر سائیں داس کی بیوی نے ایک انگلی سے کان کو زور زور سے کھجایا۔ اطمینان نہ ملا تو کان میں پڑا ہوا جھمکا اتار لیا اور کان کو دھیرے دھیرے ملنے لگی۔ اس کے کانوں کے کنارے کنارے کئی سوراخ تھے۔ کسی زمانے میں اس کے یہی کان کئی کئی طلائی بالیوں کے بوجھ سے پھلوں سے لدی ہوئی شاخوں کی مانند جھکے جھکے رہتے تھے، اب تو وقت کے ساتھ سمجھوتا کر کے وہ ایک ایک ہی جھمکا پہننے لگی ہے۔

اس کے شوہر نے کوئی جواب نہ دیا اور آنکھیں بند کیے کیے آرام کرسی کی پشت کے ساتھ سر ٹکا کر سوچتا رہ گیا تو وہ جھکور میں سارے شلغم سمیٹ کر باہر جاتی ہوئی بولی..... ''روٹی پکاؤں؟۔ پریتم اور اشوک بھی آتے ہوں گے۔''

''کہاں گئے ہیں وہ؟''

''کہیں یار دوستوں میں گپ لڑا رہے ہوں گے۔''

وہ باہر نکل گئی۔ سائیں داس سوچ میں ڈوبا بیٹھا رہا۔ ٹھاکر داس کے ساتھ اپنے تعلقات پر غور کرتا رہا۔ کتنے سال انھوں نے اسی شہر میں گذار لیے ہیں۔ وقت پر لگا کر اڑتا جا رہا ہے جب آئے تھے تو دونوں کے بچے چھوٹے تھے، آج بڑے ہو کر شادی بیاہ کی عمر کو پہنچ گئے ہیں۔ ٹھاکر داس بیٹے کی بارات لے کر تین سو میل دور ایک دوسرے شہر میں جائے گا۔ سردیوں کا موسم اور سفر کی تکلیفیں اور گرانی! ہوں!! لیکھ سنجوگ کی ہی بات ہے!

اسے اچانک کچھ آوازیں سنائی دیں۔ بولنے اور چل کر آنے کی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں سر گھما کر دیکھا۔ آنگن میں کچھ لڑکیاں اس کی بیوی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ وہ چلی گئیں۔ تو اس کی بیوی نے اندر آ کر بتایا!

''ٹھاکر داس کی لڑکیاں آئی تھیں۔ آج رات ان کے ہاں رت جگا ہے۔ گائیں بجائیں گی۔ میرے تو بھئی جوڑوں میں درد رہتا ہے۔ صاف کہہ دیا میں نہیں آ سکتی، سرلا کو بھیج دوں گی۔''

یہ کہہ کر وہ پھر رسوئی میں لوٹ گئی۔ سائیں داس پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ سرلا اگلے

سال ایم اے کر لے گی۔ اگلے سال اسے پروویڈنٹ فنڈ میں سے قرض لینا ہوگا۔ کلیم کا روپیہ پتہ نہیں کب تک ملے۔ لڑکی کے ہاتھ پیلے کرنے ہی ہوں گے۔ بھگوان کو منظور ہوا تو یہی مکان کلیم میں مل جائے گا۔ چار بڑے بڑے کمرے ہیں۔ ایک بڑا سا آنگن ہے کسی بے چارے مسلمان کا ہے۔ وہ بھی پاکستان میں کسی ہندو کے مکان میں اپنی عزت و آبرو سمیٹ کر رہ رہا ہوگا! اسے بھی کچھ غم ستاتے ہوں گے اپنے اور پرایوں کے۔ وہ بھی لوگوں کے بدلتے ہوئے رویوں کی شکایت کرتا ہوگا! اپنے صدیوں کے ٹھکانوں سے اکھڑ کر انسان ہر کہیں دکھ جھیلتا ہے۔ پر سب دن ہوت نہ ایک سمان۔ مصیبتیں بادلوں کی طرح زندگی پر چھا جاتی ہیں۔ بادل گرجتے ہیں، برستے ہیں پھر خالی ہو کر اڑ جاتے ہیں۔ مطلع صاف ہو جاتا ہے پھر دھوپ بھی نکل آتی ہے۔ سائیں داس آنکھیں بند کیے کیے مسکرا دیا۔ ایک خیالی اطمینان سا محسوس کر کے اور آنکھیں نیم وا کر کے دیوار پر لگے "اللہ اکبر" کے کتبے کو دیکھا، اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ سیاہ جلی حروف ابھر کر اس کے قریب آ گئے، اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے۔ پھر وہ ایک دوسرے میں گھلنے ملنے لگے۔ سارے حروف مل کر ایک لمبی عمودی لکیر بن گئے۔ زمین سے اٹھ کر آسمان کو چھونے والی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک پڑے۔

اچانک اس کے کانوں میں پھر کچھ آوزیں سنائی دیں اس نے پوری آنکھیں کھول دیں، آنسو پونچھ ڈالے۔ سر اٹھا کر دیکھا اس کے دونوں بیٹے چلے آ رہے تھے۔ سرخ و سفید چہرے، لمبے لمبے قد، ماتھے پر ایکٹروں کے سے انداز میں بکھرے ہوئے بال اور چوڑے پائنچوں والی پتلون میں ہاتھ ڈالے مسکراتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے سرلا چلی آ رہی ہے، اپنے بھائیوں کی لمبی اور پتلی، سنہرے بالوں کی لمبی اور موٹی سی چوٹی کو بار بار کھولتی اور گوندھتی ہوئی بولی۔

"پتا جی۔ ہم ترلوک کی بارات میں جائیں گے۔"

"ہاں پتا جی۔ ہم ضرور جائیں گے۔ وہ بہت زور دے رہا ہے۔ نہیں تو ناراض ہو جائے گا۔ سرلا بھائیوں کے پیچھے سے نکل کر باپ کے پاس آ بیٹھی۔ کرسی کے بازو پر اور سائیں داس کے کرتے کے بٹن بند کرتی ہوئی بولی۔ پتا جی میں بھی جاؤں گی، پشپا مجھے ساتھ لے جائے بغیر مانے گی نہیں۔ آپ جانتے ہیں، وہ میری کلاس فیلو ہے اور کتنی گہری فرینڈ بھی۔"

سائیں داس نے سب کی طرف حیران ہو کر دیکھا اور پھر بلند آواز میں بیوی کو سنانے

کے لیے بولا۔

''لوسنو! یہ سب کے سب بارات میں جائیں گے۔ جیسے وہ لوگ سچ مچ میں انھیں ساتھ لیے بنا روانہ ہی نہ ہوں گے۔''

اس کی بیوی نے رسوئی میں سے جواب دیا۔ ''جج پرائی احمق بچے! ان کا تو دماغ خراب ہے، آپ ہی سمجھائیے۔''

''نہیں پتا جی! ہم ضرور جائیں گے۔ اسی بہانے میرٹھ بھی دیکھ لیں گے۔ وہاں ہم ابھی تک نہیں گئے۔''

''ارے بھئی، اگر سیر سپاٹا ہی کرنا ہے تو کسی اور بہانے سے وہاں چلے جانا گرمیوں کی چھٹیوں میں۔''

''نہیں پتا جی۔ پلیز! میری ساری فرینڈز جا رہی ہیں۔''

''اچھا اچھا۔ ہٹو اب یہاں سے، سر پر سوار مت ہو۔ سوچیں گے۔ ابھی تو کئی روز پڑے ہیں۔''

''کہاں کئی روز پڑے ہیں۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ پرسوں بارات جائے گی۔ شام کی گاڑی سے۔''

''پر پتر، ان کے ساتھ ہمارے تعلقات پہلے جیسے نہیں ہیں، کہ سب کے سب شریک ہو جائیں، بس ایک جنا چلا جائے، کوئی بھی تم میں سے۔''

تینوں بچوں کے چہروں پر اداسی پُت گئی۔ کھانے پر بھی وہ منہ لٹکائے لٹکائے بیٹھے رہے۔ بڑی بے دلی سے کھانا کھایا۔ دیوار پار سے لڑکیوں کے ڈھولک بجانے اور گانے کی آواز آنے لگی تو وہ سب اپنے ماں باپ کے چہرے تکنے لگے۔ کوئی لڑکی بڑی شیریں آواز میں گا رہی تھی۔ ''من ڈولے تن ڈولے میرے دل کا گیا قرار رے!

بچوں کو ماں باپ کی آنکھوں سے امید کی کوئی جھلک نہ ملی تو وہ ایک دوسرے کی طرف بجھی بجھی نظروں سے دیکھنے لگے۔ سرلا کے لیے تو یہ سوچ سوچ کر نوالہ نگلنا مشکل ہو رہا تھا کہ اسے رت جگے میں بھی جانے کی اجازت ملتی ہے کہ نہیں! لیکن اچانک اس کی ماں نے یہ کہہ کر اس کی مایوسی انتہائی خوشی میں بدل دی۔ ''کھانا کھا لے تو ذرا دیر کے لیے وہاں چلی جانا۔''

وہ کھانا اسی دم ختم کر کے جلدی جلدی پانی کے دو گھونٹ حلق سے نیچے اتار، سلیپروں میں پاؤں پھنساتی ایک ہی چھلانگ میں باہر نکل گئی۔

پریتم اور اشوک بھی جلدی جلدی باہر جانے لگے تو سائیں داس نے پوچھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

جواب ملا۔ ''ابھی آتے ہیں پتا جی۔ ذرا تر لوک کے گھر جا رہے ہیں۔ وہاں ہمارے دوست آئے ہوئے ہیں۔''

سائیں داس تازہ حقہ بھر کر پھر کمرے میں جا بیٹھا۔ صبح کا اخبار سامنے رکھ لیا۔ اخبار کا ایک آدھ صفحہ وہ روزانہ رات کو ہی اسی وقت پڑھنے کے لیے چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اس کی بیوی بھی رسوئی کے کام کاج سے فرصت پا کر اپنے بستر پر آ بیٹھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا برتن بھی تھا جس میں وہ تیل گرم کر کے لے آئی تھی۔ انگلیاں تیل میں ڈبو ڈبو کر گھٹنوں اور پنڈلیوں پر ملنے لگی۔

پڑوس میں گانوں کی آواز اونچی ہوتی گئی تو وہ ناک چڑھا کر بولی۔ ''آج کل تو سڑی فلموں کے ہی گانے گائے جانے لگے ہیں۔ ہر موقع پر یہی سنتے سنتے کان پک گئے میرے تو!''

''ہوں!'' سائیں داس اپنے حقے کی گڑگڑاہٹ اور اخبار کی خبروں میں کھویا ہوا تھا۔ اس کی بیوی نے اپنی بات کو دُہرانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ گھٹنوں اور پنڈلیوں پر مالش کر چکی تو تیل سے چکنے ہاتھوں کو اپنے سر کے پکے ہوئے بالوں پر مل لیا جو مہندی لگانے سے ڈب کھڑبے ہو گئے تھے۔ اسی لمحے ایک گانے کی سریلی آواز کمرے میں آئی۔ سیاں جھوٹوں کا بڑا سرتاج نکلا! تو سائیں داس نے اخبار ہاتھ سے جھٹک دیا اور گرج کر بیوی سے بولا:۔

''جا کر سرلا کو بلاؤ۔ کس کی شادی پر گا رہی ہے! ہمارے کون لگتے ہیں وہ؟''

بیٹی کی آواز سن کر سائیں داس کی بیوی کے چہرے پر بھی ویسی ہی برہمی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے ابھی ابھی ٹانگوں میں گرم گرم تیل ملا تھا اور رضائی میں گھسنے لگی تھی لیکن بیٹی کو بھی منع کرنا ضروری تھا اور کون جاتا وہاں۔ اس نے جلدی جلدی دونوں ٹانگوں پر اوٹی پٹیاں چڑھائیں اور لنگڑاتی ہوئی سی باہر نکل گئی۔

جب تک سرلا کے گانے کی آواز آتی رہی، سائیں داس اخبار کی طرف متوجہ ہو سکا نہ ہی حقے کی نے میں سے دھواں کھینچ پایا۔ کچھ منٹوں کے بعد سرلا کی آواز آنی بند ہو گئی تو اس نے اخبار

پھر اپنے آگے سرکا لیا اور حقہ گڑگڑانے لگا لیکن ابھی وہ چند ہی سطریں پڑھ پایا تھا کہ اس کے کانوں میں عجیب سی آواز آ پہنچی، جیسے وہ بہت دور سے آئی ہو۔ سات سمندروں اور سات پہاڑوں پر سے پرواز کرتی ہوئی۔ بڑی جانی پہچانی آواز تھی۔ وہ ڈھولک اور گھنگھروؤں کے تال پر کوئی عورت گا رہی تھی!

میں آئی ماہیا تو مل وے
میڈا بونہہ کرنیدا اے دلی وے
بھاویں نہ جانڑیں بھاویں نہ جانڑے
میڈا ڈھول جوانیاں مانڑے

سائیں داس نے اخبار پھر ایک طرف رکھ دیا۔ حقے کی نے اس کے ہونٹوں کے ساتھ ہی لگی رہ گئی۔ وہ اداس سا ہو کر خلا میں گھورنے لگا۔ کتنی صاف، شیریں اور تیز تلوار جیسی آواز تھی! سیکڑوں میلوں پر پھیلے ہوئے اندھیرے اور سمندروں گہرائی جیسی خاموشی کا جگر چیرتی ہوئی اس کے دل میں آ کر پیوست ہو گئی تھی۔ اسے کون بلا رہا تھا۔ اس کے خوابیدہ جذبات پر کون دستک دے رہا تھا؟ برسوں پہلے بھی اس نے ایسی ہی ایک آواز سنی تھی۔ یہی بول سنے تھے، جب وہ بیس سال کا گبرو تھا۔ سر پر لمبے لمبے پٹے سجاتا تھا اور ننھی ننھی سنہری و بھوری مونچھیں رکھنے لگا تھا۔ مغربی پنجاب میں دریائے سندھ کے کنارے راحت بخش، خشک اور سنہری ریت کے ٹیلوں کے درمیان بسے ہوئے علاقے میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ماہیا گایا کرتا تھا۔ اس کے لبوں سے نکلے ہوئے بول جب چاندنی راتوں میں اڑتے اڑتے جوان کنواریوں کے کانوں میں جا پہنچتے تو وہ اپنی چھتوں پر لیٹی لیٹی چونک کر اٹھ بیٹھتی تھیں اور منڈیروں پر چڑھ کر حد نظر تک چاندنی میں نہائے ہوئے ریت کے ٹیلوں کی طرف بڑی بے چینی سے گھورنے لگتی تھیں۔

اچانک سائیں داس کو یاد آیا، اس کی بیوی سرلا کو بلا لانے کے لیے گئی ہوئی ہے۔ وہ ابھی تک لوٹ کر نہیں آئی ہے۔ کیا اس نے بھی یہی آواز سنی ہے؟ اگر سن لیتی تو وہ بھی اسی طرح حیران رہ جاتی۔ اس کی مانند اپنے آپ کو بھول جاتی:۔

میں پانی بھریندی آں راتیں
شالا وڈی ہووی حیاتی

بھانویں جانڑے بھانویں نہ جانڑے
میڈا ڈھول جوانیاں مانڑے

یہ محض آواز نہ تھی۔ کوئی غیبی کشش تھی جو اسے اپنی جانب کھینچ رہی تھی، اسے پکار رہی تھی صدا دے رہی تھی، لمبی عمر پانے کی دعا بھی اور اس کے سامنے اپنے دل کی کیفیت بھی بیان کر رہی تھی۔ چاندنی رات میں کنویں یا ندی پر پانی بھرنے کے بہانے جاتی ہوئی اس سے ملنے کی التجا کر رہی تھی۔ اس کی جوانی کا واسطہ دے کر اسے بلا رہی تھی۔ اسے یاد تھا، عمر کے کئی کڑے کوس نکل جانے کے باوجود اسے وہ ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ عشق اور اضطراب میں گذاری ہوئی ساری کی ساری کیفیت اس کے ذہن میں ابھی تازہ تھی۔ اپنی پوری دردانگیزی اور شدت کے ساتھ وہ کیسے بھول سکتا تھا زندگی کے ان بہترین لمحوں کو جو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آسکتے تھے!

وہ آہستہ سے اٹھا۔ تہمد کو اچھی طرح کس کے کمر کے گرد باندھا اور بنا کھانسے، بنا کوئی آہٹ پیدا کیے ہوئے ہولے ہولے قدم رکھتا ہوا آنگن میں سے گذرا اور پڑوس کی دیوار کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اندھیرے میں دیوار کے ساتھ بنے ہوئے تندور کو ٹٹولا۔ اس کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور ایک لکڑی کے صندوق سے کوئلے الٹ کر اسے تندور کے اوپر جما دیا اور پھر سنبھل سنبھل کر اس کے اوپر چڑھ گیا۔ اس کا سر دیوار سے اوپر نکل سکتا تھا۔ وہ جھانک کر بھی دیکھ سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ سر جھکا کر ہی گانا سنتا رہا، جو اس کی روح کی پیاس کو بجھاتا بھی تھا اور بھڑکاتا بھی۔ یہ نہ دیکھ سکا کہ کون گا رہی تھی۔ وہ اس کے کانوں میں رس ٹپکانے والی آواز ہی سنتا رہا۔

اساں اِتھے تے ماہی ساڈا اوڑ چھے
کلی راتیں پیا دل دھڑکے
بھاویں جانڑے بھاویں نہ جانڑے
میڈا ڈھول جوانیاں مانڑے

وہ تندور کے اوپر اکڑوں بیٹھا بیٹھا سن رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ وہ کمرے کی روشنی بھی بجھا کر آیا تھا لیکن گیت کے جادو بھرے الفاظ اس کے سامنے جیسے سیمیں پردے پر کوئی فلم پیش کرتے جا رہے تھے۔ برستی کالی و تنہا راتوں میں کھڑکی سے لگ کر وہ اپنے محبوب کا انتظار کرتی ہوئی کوئی حسینہ! وہ کب واپس آئے گا؟ تلاشِ معاش اس کے محبوب کو اس سے

کب تک جدار رکھے گی؟

میں اتھے تے ماہی میڈا لوہدرے
میڈا اکلا پیادل اودھدرے
رُ ملنے دی، ڈھول جانی

ڈھولک کی تھاپ تیز ہوگئی۔ تال بدل گیا۔ گھنگھروؤں کے چھنکار کے اور عورتوں و لڑکیوں کے قہقہے بھی بلند ہوگئے اور ایک اور گیت ایک نئی آواز کے ساتھ بجنے لگا۔

تیڈی ماتاں میڈی ماسی
بکّے چلیے تے ادب نہ راہی
دکھری تھیندی آں ڈھول جانی!
ساڈی گلی آویں تیڈی مہربانی

ہر بار ایک مختلف آواز آنے لگی۔ نئے بولوں کے ساتھ، طنز، مزاح اور حقیقت سے بھرپور باتیں، زندگی کی ساری سچائیاں اور تلخیاں ان بولوں میں موجود تھیں۔ ناچ گانے اور قہقہوں کے ساتھ ایک دوسرے کو کوسا جارہا تھا۔ شکوے اور شکایتیں کی جارہی تھیں یہ مقصد کسی دوسرے ذریعے سے حاصل کرلینا ذرا مشکل لگتا ہے۔ یہ صرف ان گیتوں کے ہی ذریعے آسان ہوجاتا تھا۔ گیت جو ایک قوم کی خاصیت تھے، گیت جو ایک قوم کا مزاج تھے۔ ایک خاص علاقے کی صدیوں کی روایات اور تہذیب و تمدن کے حامل تھے، سینکڑوں میل کا فاصلہ اور دشوار گزار منزلوں کی صعوبتیں برداشت کرکے یہ گیت سینوں کے اندر محفوظ کرکے یہاں تک لے آئے گئے تھے۔ کتنے بھائی، کتنی بہنیں اور بچے اور ماں باپ گنوا کر بھی اس خزانے کو لٹنے سے بچالیا گیا تھا۔ آج وڑچھا لکھنؤ سے بہت دور ہے۔ لودھراں لوٹ جانے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے، لیکن ان علاقوں کی یاد، ان کا حسن ان کی سردی اور گرمی سینے کے اندر پوری طرح محفوظ ہے۔ نئی نسل کے لڑکے اور لڑکیاں حیران ہو رہی ہیں۔ وہ لوگ اس زبان کے، جس میں گیت کہے گئے ہیں، محاوروں سے اور چٹخاروں سے آشنا نہیں ہیں۔ محبت، سادگی، بے ساختگی، خلوص اور حسن سے مالا مال زبان کا محافظ اب کون بنے گا۔ حالات نے انھیں نئی سرزمین پر پیدا کردیا ہے۔ بولنے اور سمجھنے کے لیے ایک نئی زبان دے دی ہے۔ ان کے آباواجداد کا اتنا بڑا سرمایہ ان کے ماں باپ کے ساتھ ہی ختم ہوجائے

گا۔ تیس سے پچاس برس تک عمر کی عورتوں کی یہ ٹولیاں پھر یہ گیت نہیں گائیں گی۔ یہ سارے سُر خاموش ہو جائیں گے۔ یہ تال ٹوٹ جائیں گے۔ یہ چراغ بجھ جائیں گے۔ ایک ایک کر کے سارے چراغ۔

سائیں داس کے کانوں میں اچانک اس کی بیوی کی آواز آئی تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بالکل بے اختیار سا ہو کر دیوار سے سر نکال لیا، اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس کے چہرے پر ادھر جگمگاتی ہوئی تیز روشنی پڑ سکتی ہے۔ اس نے عورتوں کے ہجوم میں اپنی بیوی کو دیکھ لیا اور حیران رہ گیا۔ وہ سر پر پگڑی کے انداز میں اپنا دوپٹہ باندھے اور جوڑوں کا درد بھول کر ناچ رہی تھی اور گا رہی تھی۔

میں اِتھے تے ماہی میڈا اواں تے
لگا آویں بدلاں دی چھاں تے
رُت گری دی، ڈھول جانی
ساڈی گلی آویں تیڈی مہربانی

اس نے دونوں بازو دیوار پر ٹیک دیے۔ اس کا جی چاہا بیوی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر وہ بھی ایک دو بولیاں گائے۔ عورتوں و لڑکیوں کو ناچتا ہوا دیکھنے کے لیے بہت سے مرد لڑکے کمروں سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ بڑی مسرت سے سب کی طرف دیکھتا رہا۔ ان سب کو وہ جانتا تھا۔ اچانک کسی نے اس کے بازو کو چھوا۔ اور اس کی نگاہ دیوار کے اس پار ٹھاکر داس پر ٹک کر رہ گئی جو کسی چیز پر چڑھ کر ابھر رہا تھا۔ اس کے بالمقابل آ رہا تھا۔ ٹھاکر داس زور سے ہنس بھی پڑا۔ اور خوشی سے گلوگیر آواز میں بولا۔ ''آنا یار! ادھر آ جا۔ بڑا مزہ آ رہا ہے۔''

سائیں داس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔ ٹھاکر داس کو گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے خلوص کو پرکھا جسے ان کے آبائی علاقے کے جذبات بھرے لوک گیت دل کی گہرائیوں میں سے نثار کر اوپر لے آئے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔ اپنے بازوؤں پر بدن کا سارا بوجھ ڈال کر اوپر کو اٹھا اور اچک کر دیوار پر بیٹھ گیا۔ ٹھاکر داس کے کندھے پر ایک بازو پھیلا دیا اور دوسرا ہاتھ اپنے کان پر رکھ کر ایک لمبی تان لگائی۔ اس کے سامنے اس کے بچے تھے، بیوی تھی، محلے بھر کی عورتیں، لڑکیاں اور مرد تھے، وہ سب کی موجودگی سے اچانک بے نیاز ہو گیا! اپنی عمر کو بھی بھول

گیا۔ اپنے آپ کو پھر سے لے گیا جوانی کے دور میں۔

چھلا پائی کھڑی میں ڈوں
نمبردار وڑی داتوں
وسن ڈے غریباں نوں
دے بلا کھنا
چھلا ٹوری رکھنا

اس کی آواز سن کر اور اسے دیوار پر بیٹھا دیکھ کر عورتیں اور لڑکیاں مارے شرم کے ایک دوسرے پر گر گر ڈھیر ہونے لگیں اور اٹھا کر داس نے ہنستے ہنستے سائیں داس کو اپنے بوڑھے مگر مضبوط بازوؤں پر اٹھا کر اپنی طرف اتار لیا۔

نصیب جلی

دروازے کے باہر سائیکل کی گھنٹی سنتے ہی موتا سنگھ کے بچے ..... دروازہ کھولنے کے لیے دوڑ پڑے۔ تینوں بچوں نے ایک ساتھ کنڈی پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ کھول کر تینوں ایک ساتھ چلّائے۔

''وار جی آ گئے، وار جی آ گئے!''

اور پھر تینوں ایک ساتھ ہی اچانک موتا سنگھ کی سائیکل پر سوار ہو گئے۔ ایک آگے بار پر۔ دوسرا گدی پر اور تیسرا پیچھے کیریر کے اوپر، موتا سنگھ ہنستا ہوا داخل ہوا۔ بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ دھوپ میں سکھانے کے لیے رکھی ہوئی دال سمیٹ رہی تھی دھوپ صحن میں سے ہوتی ہوئی اوپر دیوار کی طرف جا پہنچی تھی۔

دھوپ روز اسی وقت برجی پر چلی جاتی تھی۔ موتا سنگھ بھی روز اسی وقت ورکشاپ سے گھر لوٹتا تھا۔ تیل کے بڑے بڑے دھبوں والی خاکی قمیص، نیکر اور میل سے سیاہ، چکّٹ بوٹ پہنے ہوئے، اس کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی ہوتی سیاہ و سفید بالوں سے بھری بھری ڈاڑھی مونچھ کے اندر سے اس کی مسکراہٹ جیسے چھن چھن کر باہر آتی اور دیکھنے اور ملنے والوں کو نہال کر دیتی۔

جس قدر وہ تندرست، توانا اور شوخ مزاج تھا اس کی بیوی اتنی ہی کمزور اور کم گو تھی۔ پانچ بچوں کو جنم دینے کے بعد اس کے جسم میں تن کر کھڑا ہونے اور چلنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔

اس کے خوب صورت قد اور اعضا کی دلکش مناسبت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی جوانی قیامت رہی ہوگی۔ ان تینوں بچوں کے علاوہ جو باپ کی سائیکل پر سوار تھے دو لڑکیاں بڑی تھیں۔ سب سے بڑی کا دو سال پہلے بیاہ ہو چکا تھا۔ اس سے چھوٹی دسویں میں پڑھتی تھی۔ وہ رسوئی میں بیٹھی انگیٹھی پھونک رہی تھی۔ باپ کی آواز سنتے ہی باہر نکل آئی اور بولی۔

''وار جی، آج ایک خط آیا ہے۔ پاکستان سے''

''پاکستان سے؟'' موتا سنگھ نے حیرانی ظاہر کی۔ ''کس کا خط ہے من جیت؟''

من جیت کمرے سے اندر دیوار گیر پر سجا کر رکھے ہوئے گرو گرنتھ صاحب کے پیچھے سے ایک لفافہ نکال کر باہر لے آئی جس پر پاکستان گورنمنٹ کے ٹکٹ لگے ہوئے تھے۔ باپ کے ہاتھ میں دیتی ہوئی بولی۔

''پتہ نہیں کس کا ہے؟ اردو میں ہے۔ میں تو اردو جانتی نہیں۔''

بچوں نے بے قابو ہو کر سائیکل کو گرانا چاہا۔ موتا سنگھ کے ہاتھ سے خط گر گیا اس نے جلدی سے سائیکل من جیت کے حوالے کی اور خط اٹھا کر صحن میں پڑی ہوئی ایک کھاٹ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ سے پگڑی اتار کر گھٹنوں پر آگے رکھ لی دوسرے ہاتھ سے لفافے کے اندر جھانکا اور تہ کیا ہوا کاغذ کھینچا۔ ایک فل اسکیپ کا غذ تھا۔ دونوں طرف لکھا ہوا۔

''اُترو اُترو، نہیں تو گرا دونگی'' من جیت نے بھائیوں کو سائیکل پر سے اتار کر سائیکل برآمدے میں کھڑی کر دی۔ بچے پھر باپ کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک پیچھے سے گردن میں باہیں ڈال کر جھولنے لگا۔ دوسرا ساتھ سٹ کر بیٹھ گیا۔ تیسرے نے ہاتھ سے لفافہ لے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ ٹکٹ کس قسم کا ہے وار جی؟''

''یہ پاکستان کا ہے بیٹے!''

''پاکستان کہاں ہے وار جی؟''

اُدھر ہے پاکستان جہاں تیرے نانا رہتے ہیں ناں، ڈیرہ بابا نانک! واں سے بس تھوڑی دور جاتا ہے۔ لا۔ اب مجھے دے دے لفافہ۔ ان سب کو باہر لے جا۔ من جیت! میں خط پڑھ لوں۔''

''یہ.....؟ دیکھتا ہوں۔ یہ.....'' خط کے آخر میں وہ غلام سرور کا نام پڑھ کر چونک گیا۔

''غلام سرور!'' اس کے منہ سے نکلا، اور اس کی نگاہ اپنی بیوی کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بھی غلام سرور کا نام سن کر چونک پڑی تھی۔ اور دال سمیٹتے سمیٹتے سر گھما کر دیکھنے لگی تھی۔

''کون غلام سرور؟'' من جیت بھائیوں کو باپ کے پاس سے ہٹا کر وہاں خود بیٹھ گئی اور پوچھا..... ''ان کا پہلے کبھی آپ کو خط نہیں آیا؟''

''ہاں پہلے کبھی نہیں آیا۔'' موتا سنگھ جلدی جلدی خط پڑھنے لگا۔ وہ دو دو سطریں ایک ساتھ پڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ غلام سرور نے اسے ایک عرصے بعد کیوں یاد کیا تھا۔ بارہ سال بعد پہلی بار اس نے اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ پہلی بار اس کی خیریت دریافت کر رہا تھا وہ تو سمجھے ہوئے تھا غلام سرور زندہ نہیں بچا ہوگا۔ اگر بچ بھی گیا تھا تو آخر مسلمان تھا اس کی خیریت کیوں دریافت کرتا.....! وہ اس کا کون تھا؟ بس دو سال ہی کی تو دوستی تھی ان کے درمیان! جب وہ ایک ساتھ ورکشاپ میں فٹر بھرتی ہوئے تھے ایک ہی ورکشاپ میں انھیں جگہ ملی تھی۔ ایک ہی بیرک میں ایک دوسرے کے پڑوسی بنے تھے..... صرف دو سال کے لیے..... اور اب اس قلیل سی مدت پر بارہ برس کا بہت گہرا، بہت اونچا ملبہ پڑ چکا تھا۔ اس ملبے کے نیچے ان کے کتنے مشترکہ قہقہے، سانجھے مذاق اور بہت ساری یادیں دفن ہو کر ختم ہو چکی تھیں۔ وقت ایک گہرا، تیز و تند اور بار بار راستہ بدل لینے والا دریا بھی ہے جو اپنے طوفانی بہاؤ کے ساتھ صدیوں کی جمی ہوئی دھرتی کے بڑے بڑے چٹان سے ٹکڑے الگ کر کے کاٹ کاٹ کر بہا لے جاتا ہے اور پھر ذرہ ذرہ کر کے یہاں وہاں ان کو پھینک کر اس دھرتی کی ہستی ختم کر دیتا ہے۔ نام و نشان تک مٹا ڈالتا ہے۔ اس مٹی کی اپنی خوشبو نہیں رہتی۔ اپنا سنگیت مر جاتا ہے۔ کسی کو یاد نہیں رہتا۔ یہاں ایک بہت بڑی عمارت تھی۔ وہاں ایک بہت بڑا میدان تھا۔ اِدھر ایک پہنچے ہوئے فقیر کی قبر تھی۔ اس طرف ایک بہت بڑا مرگھٹ تھا۔ ایک عالیشان مویشی گاہ تھی جہاں میلوں دور دور سے دیہاتی آ کر یہاں ڈھور ڈنگروں کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ میلے میں جمع ہو کر ناچتے اور گاتے تھے۔ زیرِ آب پڑی ہوئی دھرتی کے سینے پر منوں اور مٹی آ آ کر پڑتی جاتی ہے۔

خط پڑھتے پڑھتے موتا سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ غلام سرور نے اسے کبھی بھلایا نہیں تھا۔ اس کا پتہ کئی ذرائع سے دریافت کرتا رہا تھا۔ بیسیوں دوستوں سے پوچھا تھا کسی نے جواب دیا تھا تو پتہ نہیں بتا سکا تھا۔ کسی نے جواب ہی نہیں دیا تھا۔ موتا سنگھ کئی سال ہوئے امرتسر کی

ورکشاپ سے تبدیل ہو کر دہلی میں آ گیا تھا۔ کسی کو اس کا پتہ آسانی سے تھوڑی مل سکتا تھا۔ غلام سرور نے اس پتے کی کھوج اپنے ملک میں مقیم ہندستانی ہائی کمشنر کی مدد سے لگائی تھی۔ اور اسے وہ دن یاد دلایا تھا جب فسادات کی مارکاٹ میں غلام سرور اپنی بیرک میں تنہا رہ گیا تھا۔ اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ رات کو وہ دیواریں اور چھتیں پھلانگتا ہوا موتا سنگھ کے گھر میں آ کودا تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی دم میں اس کا خاتمہ ہو جانے والا تھا۔ اسے مارنے کے لیے اس کے کئی پڑوسی اس کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ موتا سنگھ کے پاس وہ کسی امید پر نہیں آیا تھا۔ امیدیں تو ختم ہو چکی تھیں۔ آنکھوں کی مروّت رہی تھی نہ دلوں کی محبت۔ سرحد کے دونوں طرف ایک عجیب سی دیوانگی اور وحشت کا دور دورہ تھا۔ برہنہ تلواریں، نیزے، گنڈاسے چاروں طرف مصروفِ رقص تھے۔ بجلی کی سی چمک کے ساتھ کوندتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں سر تن سے جدا کر دیتے تھے۔ وہ موتا سنگھ سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا۔ موتا سنگھ بھی اسے قتل کر سکتا تھا۔ اپنے بھائیوں اور بہنوں کے قتل اور اغوا کا انتقام اس کی بوٹی بوٹی الگ کر کے لے سکتا تھا!

جس وقت وہ دیوار پر سے لٹک کر دھم سے زمین پر گرا تو اس وقت موتا سنگھ اپنی روتی ہوئی چھوٹی بچی کو سینے کے ساتھ لگائے اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہی من جیت تھی وہ بچی۔ اس کی بیوی برآمدے میں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ صحن میں دھب کی آواز سن کر دونوں چونک پڑے تھے۔ وہ سمجھے تھے شاید مسلسل بارشوں کی وجہ سے دیوار کا ایک حصہ گر گیا ہے۔ موتا سنگھ نے قریب جا کر دیکھا تو وہ غلام سرور تھا۔ زمین پر گھٹنوں کے بل گرا اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جو موت کی طرح خوفناک تھیں..... ناامید تھیں..... دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا۔ خاموش ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ ایک دوسرے کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کر رہے تھے۔ ایسی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ بس صرف زبان بند تھی۔ دل و دماغ پر بہت سے بوجھ پڑے ہوئے تھے۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی دونوں سمجھتے تھے۔ دونوں جانتے تھے۔ کچھ دیر تک موتا سنگھ خاموش کھڑا رہا۔ جب غلام سرور کی تلاش میں نکلا ہوا ہجوم دروازے پر پہنچ کر دستک دینے لگا تو غلام سرور نے ایک ایسی سسکی لے کر سر نہواڑ لیا۔ موتا سنگھ اسے بچانا بھی چاہتا تو اب یہ اس کے بس میں نہیں تھا، فسادی اس کا دروازہ توڑ کر اندر آ جانا چاہتے تھے۔ انھیں معلوم ہو چکا تھا غلام سرور اسی کوارٹر میں کودا تھا۔

اچانک موتا سنگھ نے اس کے سر کو چھوا۔ اس کا کندھا ہلایا۔ پھر ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف لے جانے لگا۔ اس میں اندر چلنے کی اب سکت کہاں تھی؟ گھٹنا زخمی ہو چکا تھا۔ اسے لڑکھڑاتا دیکھ کر موتا سنگھ کو غصہ آ گیا۔ ماں کی ایک گالی دے کر اسے گھسیٹتا ہوا چارپائی کے پاس لے گیا اور اس پر غلام سرور کو پٹخ کر بولا.....

''مر یہاں!''

جلدی سے ایک رضائی کمرے میں سے لا کر اس کے اوپر ڈال دی۔ اسی چارپائی پر اس کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ چلائی۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''تو بکواس بند کر نہیں تو کرپان سینے میں گھونپ دوں گا۔''

موتا سنگھ سچ مچ کرپان لے کر اس کے سر پر کھڑا ہو گیا تھا۔ بچی کو نیچے فرش پر گرا دیا تھا جو زار و قطار بلبلا رہی تھی۔

''دونوں لیٹے رہو سیدھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ بالکل لگ کر۔ کسی کو شک نہ ہو کہ دو سوئے ہوئے ہیں۔''

یہ سن کر غلام سرور اور موتا سنگھ کی بیوی کی رگوں کا خون منجمد ہو کر رہ گیا۔ دونوں کے جسم بالکل سن ہو کر رہ گئے، بے حس و حرکت، رضائی کے باہر صرف موتا سنگھ کی بیوی کا چہرہ تھا..... وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرف دیکھ رہی تھی۔ سمجھ رہی تھی۔ پاگل ہو گیا ہے.....

اسی وقت بہت سے لوگ دیوار پھاند کر اندر آ گئے تھے۔ دروازہ کھول کر انھوں نے اور بھی بہت سے لوگوں کو اندر بلا لیا تھا۔ صحن میں تل دھرنے کو جگہ نہیں رہی تھی۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا۔ ہر شخص غلام سرور کی جان لینا چاہتا تھا لیکن غلام سرور وہاں کہاں تھا۔ انھوں نے گھر کا کونہ کونہ چھان مارا تھا۔ پھر حیران اور مایوس ہو کر وہاں سے چلے گئے تھے۔ غلام سرور نے لکھا تھا۔

''مجھے آج بھی ان لمحوں کی یاد آتی ہے تو میرا خون اسی طرح رگوں کے اندر جمنے لگتا ہے۔ خدا کی قسم! تم نے وہ کام کیا تھا جو ایسے حالات میں میں نہ کر سکتا، کبھی نہ کر سکتا۔ میرا سر تم دونوں کے آگے ہمیشہ تا زندگی جھکا رہے گا۔ میں اجمیر شریف میں چشتی والے خواجہ کے عرس میں

شریک ہونے کے لیے آرہا ہوں۔ اس مہینے کی پندرہ تاریخ کو فرنٹیر میل سے دہلی پہنچوں گا۔ ایک دن قیام تمھارے گھر پر کروں گا۔ تم مجھے اسٹیشن پر ضرور ملنا۔ خدا جانتا ہے تم سے کہنے کے لیے میرے دل میں اَن گنت باتیں ہیں۔ ملو گے تو سب کہہ سناؤں گا اب تو تمھاری دونوں لڑکیاں سیانی ہوگئی ہوں گی شاید شادی بھی کر چکے ہو گے اُن کی۔ اور بھی بال بچے ہوں گے تمھارے۔ ان سب سے میرا الگ الگ پیار کہنا۔ بھابی صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض۔ میرے بھی چار بچے ہیں، خیر سے بڑے بڑے ہیں پڑھتے ہیں۔ ملنے پر سب کی کیفیت سناؤں گا۔ ملنا ضرور۔ ورنہ تمھارا گھر ڈھونڈھنے میں مجھے بہت دقت ہوگی۔

تمھارا۔ غلام سرور

مستری (فٹر) گریڈ اوّل مشین شاپ لوکو مغل پورہ

این ڈبلیو آر۔ مغربی پاکستان

خط ختم ہو چکا تھا۔ خط کو تہہ کر کے وہ لفافے میں رکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری فکر پیدا ہو چلی تھی۔ اور ایک قسم کی سختی بھی، جیسے اس کے چہرے کی ڈھیلی ڈھالی جلد اچانک تن ہوگئی ہو۔

اُس کی بیوی دونوں ہاتھوں میں ایک چھاج میں دال بٹور کر لاتی ہوئی اس کے پاس کھڑی ہوگئی۔ شلوار، قمیص اور دوپٹہ میں دبلا پتلا جسم، ہلکے ہلکے سیاہ بال جو اپنی چمک کھو کر اب مرجھائے ہوئے نظر آرہے تھے۔ چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اس کے۔ بولی.....

''یہ وہی غلام سرور ہے جو امرتسر میں ہماری بارک میں رہتا تھا؟''

موتا سنگھ نے بیوی کو گھورا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا خوف ابھر آیا، پھر اس خوف پر درشتی اور نفرت چھا گئی۔ اس نے جواب دیا۔

''ہاں''!

''کیا لکھا ہے اس نے؟'' اس کی بیوی نے پھر پوچھا۔

''وہ اجمیر کے عرس میں آرہا ہے۔ کہتا ہے تمھارے گھر بھی آؤں گا ملنے کے لیے۔ لیکن میں اسے یہاں نہیں لاؤں گا۔''

''کیوں؟''..... یکا یک اس کی بیوی نے چھاج پھینک دی۔ دوپٹے کو مروڑ کر دونوں ہاتھوں کے گرد اس طرح سختی سے لپیٹنے لگی، جیسے کسی کی گردن مروڑ رہی ہو۔ کڑک کر پوچھا.....

''بولو اسے یہاں کیوں نہیں لاؤ گے؟''

''ماں، ماں، تمھیں کیا ہو گیا ہے؟'' من جیت گھبرا کے پرے ہٹ گئی موتا سنگھ بھی گھبرا کر چارپائی سے کھڑا ہو گیا، جیسے وہ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئی تھی! بولا۔

''من جیت کی ماں! میں اس سے ملوں گا بھی نہیں۔ اس کے سامنے جاتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی ہے۔''

''شرم سی محسوس ہوتی ہے؟؟''

بپھر کر اس نے خاوند کا گریبان پکڑ لیا.....

''تمھیں شرم محسوس ہوتی ہے؟ آج شرم محسوس ہوتی ہے۔ جب میں بوڑھی ہو گئی ہوں!..... بارہ برس پہلے شرم نہیں محسوس ہوئی تھی جب میں جوان تھی.....تب تو تم نے میری چھاتی پر کرپان رکھ کر مجھے خاموش کرا دیا تھا۔ میں اپنی چھاتی کے اندر پڑے ہوئے اتنے بڑے پھٹ کو آج تک نہیں بھول سکی۔ تمھیں بھی وہ پھٹ نظر نہیں آیا کبھی! کیسے نظر آ سکتا تھا..... یہ نصیب جلی میں ہی ہوں جو آج تک چپکے چپکے رو رو کر سسک سسک کر اس گھاؤ کی پرورش کرتی رہی ہوں۔ میں اسی دن مر جاتی، اسی وقت جان دے دیتی.....لیکن تم نے مرنے نہیں دیا۔ تم نے مجھے رو کے رکھا تھا۔ تم نے مجھے دلاسہ دیا تھا، تم نے مجھے یقین دلایا تھا۔ اس بات کو کبھی یاد نہیں کرو گے۔ کبھی نفرت نہیں کرو گے۔ کبھی طعنہ نہیں دو گے۔ آج تمھیں اس سے ملتے ہوئے شرم کیوں آ رہی ہے؟..... تمھیں یہ سوچ اس وقت کیوں نہیں آئی.....!؟ میری بھی کوئی شرم ہے! میری بھی کوئی عزت ہے!!.....میرا زخم آج پھر پھٹ گیا ہے۔.....میری عزت آج پھر مٹی میں ملی ہے.....!!!''

یہ کہتے کہتے وہ زار زار روتی ہوئی سینہ کوبی کرنے لگی.....اور دھم سے بیٹھ کر اپنا سر فرش کے ساتھ ٹکرانے لگی۔

زہر تھوڑا سا

اتنی رات گئے اپنے دروازے پر ایک نوجوان لڑکی کو تنہا پا کر میں متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ نیند میں ڈوبی ڈوبی آنکھیں ملیں اور کیروسین لیمپ روشن کرنے کے لیے ماچس ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس سے کہا۔ ''ذرا رو ہیں ٹھہرو، روشنی کرلوں۔''

لیمپ جلایا تو میری نظر ٹک ٹک کرتے کلاک کی طرف اٹھ گئی۔ تین بج رہے تھے میں نے جماہی لی اور سر کے بکھرے ہوئے بالوں کا جوڑا باندھنے لگا۔

''سردار جی، میں بہت جلدی میں، آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

وہ اندر چلی آئی، اس کی آواز تیز اور صاف تھی، جس میں کسی قسم کی تھرتھراہٹ نہیں تھی۔ وہ انیس بیس برس کی ایک شادی شدہ لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے گہرے بھورے رنگ کی شال اوڑھ رکھی تھی۔ پہلے تو اس نے ادھر ادھر دیکھا، پھر بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہ پا کر ٹکٹ کاؤنٹر کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔

ایک سنسان و ویران مقام پر رات کے پچھلے پہر اپنے دفتر میں ایک نوجوان لڑکی کی اچانک آمد سے میرا دل دھک دھک کر رہا تھا، اگرچہ وہ میری بیٹیوں کے برابر تھی۔ پھر بھی میں نے سوچا، وہ ایک عورت تو ہے اور مجھے نہیں معلوم وہ میرے پاس کیوں آئی ہے؟

کھلے ہوئے دروازے سے سرد ہوا کا جھونکا آیا اور میری ننگی ٹانگوں سے ٹکراتا ہوا

سارے کمرے میں پھیل گیا۔ ادھر ادھر میزوں پر اور ریکوں میں پڑے سرکاری کاغذات پھڑ پھڑا گئے، بلکہ جیسے جاگ اٹھے۔ میں نے جسم پر صرف ایک کچھا پہن رکھا تھا۔ جلدی سے قمیض گلے میں ڈالی۔ بستر کے نیچے رکھی ہوئی گرم نیلی پتلون نکال کر ٹانگوں پر چڑھائی۔ اور پھر آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ بستر لپیٹ کر چارپائی کھڑی کر دی۔ دیوار کے ساتھ لگا کر بستر اسی پر رکھ دیا۔

میں جالندھر ضلع کے ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن چولانگ پر فینگ اسٹیشن ماسٹر تھا، جس کی تمام تر عمارت اسی ایک کمرے اور اسٹاف کے تین کوارٹروں پر مشتمل تھی جو دفتر سے ذرا فاصلے پر بنے تھے۔ ایک کوارٹر میں خاکروب رہتا تھا، دوسرے میں پانی پلانے اور لیمپ جلانے والا پورٹر اور تیسرا جو بیرے لیے تھا خالی پڑا تھا۔ میں تنہا ہونے کی وجہ سے دفتر ہی میں رات کو بیزاور کرسیاں ہٹا کر ایک چارپائی سونے کے لیے ڈال لیتا تھا۔ صبح چار بجے جو گاڑی پکریاں سے آ کر جالندھر جاتی تھی اس پر موجود رہنے کے لیے بڑی آسانی ہوتی تھی۔ مسافروں کی ٹکٹ کے لیے پکار سنتے ہی میں کاؤنٹر کے سامنے جا کھڑا ہو جاتا۔ چند ایک ٹکٹیں بیچ کر پھر بستر پر آ لیٹتا۔ پورٹر ہی باہر جا کر گاڑی چلنے کی ہری بتی دکھایا کرتا تھا۔ مجھے رات کے وقت باہر نکلنے کی کبھی کبھی ضرورت پڑتی تھی۔

میں نے سر پر پگڑی باندھتے ہوئے اس لڑکی کی طرف دیکھا اور سوچا، وہ کون ہو سکتی ہے، یہاں کیوں آئی ہے؟

وہ بڑی گہری نظر سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ کسی آس پاس کے گاؤں کی بہو بیٹی ہو! گھر سے بھاگ کر کہیں جا رہی ہو! اسی جالندھر جانے والی گاڑی سے!

''تم کون ہو پتر!'' میں نے کرسی پر پڑی ہوئی سرکاری کتابیں اٹھا کر کاؤنٹر پر رکھ دیں۔

''سردار جی!'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''میں آپ کو یہی بتانے کے لیے آئی ہوں۔ میں آپ کو جانتی ہوں۔ آپ بھگونت اور کلونت کے دار جی ہیں۔''

اپنی بیٹیوں کے نام سن کر میں چونک اٹھا۔ وہ انھیں کیسے جانتی ہے۔ وہ ان کی سہیلی نہیں معلوم ہوتی۔ اس کا چہرہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔

''بیٹھو'' میں نے کرسی اس کی طرف سرکا دی۔ خود کمبل اوڑھ کر میز کے کنارے بیٹھ گیا۔

وہ چھم چھم کرتی کرسی پر آ بیٹھی۔ اس کے پاؤں میں پہنی ہوئی پازیبوں کی جھنکار میں نے پہلی بار سنی جو اس سناٹے میں خاصی اونچی معلوم ہوئی۔

میں نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ وہاں کوئی مسافر موجود نہیں تھا۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکوں سے بچنے کے لیے میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ اس کی طرف بڑی بے قراری سے دیکھا جو کچھ وہ کہنا چاہتی ہے۔ اب جلدی سے کہہ بھی ڈالے! جیسے وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ پہلو بدل کر میری طرف دیکھا۔ سردی سے سڑسڑاتی ہوئی ناک بھی پونچھی۔

''میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ آپ کا نام سردار حکم سنگھ ہے۔ آپ پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھی ہیں۔''

میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میرا دل پہلے کی طرح دھڑک رہا تھا، کیا جانے، وہ کیا کچھ کہنا چاہتی ہے! وہ مجھے ابھی تک خاصی پراسرار لگ رہی تھی۔

''آپ کی دونوں بیٹیوں کو وہاں کے غنڈے اٹھا لے گئے تھے، ٹھیک ہے نا!''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یکبارگی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ لڑکی پاکستان سے ہی آ رہی ہے۔

''فسادوں کے دوران آپ کی بیوی، دو چھوٹے بیٹے اور بوڑھے باپ کو بھی مار دیا گیا تھا۔!''

میں نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا اور محسوس کیا، گزرا ہوا دور ہلاکت پھر سامنے آ گیا ہے۔ بیوی بچوں اور بوڑھے باپ کے ذکر کے ساتھ ہی میرے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا پھر اس پر نگاہیں جما دیں۔ یہ لڑکی جلدی جلدی کیوں نہیں بتا دیتی۔ وہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے؟ مجھے یہ سب کچھ کیوں یاد دلا رہی ہے؟۔

میں نے دیکھا وہ شاید میرے اضطراب کی کیفیت ہی سمجھ کر مسکرا دی تھی، بولی۔

''میں آپ کو سب کچھ بتاؤں۔ کیونکہ آپ بھگونت کور اور کلونت کور کے دارجی ہیں۔ جنھیں پاکستانی غنڈے آپ سے زبردستی چھین کر لے گئے تھے۔ آپ کو مار مار کر ادھ موا کر کے چھوڑ گئے تھے۔ اپنے طور پر تو انھوں نے آپ کو ختم ہی کر دیا تھا، لیکن آپ یہ دکھ اٹھانے کے لیے زندہ رہ گئے کہ آپ کی بیٹیاں کس حال میں ہوں گی! آپ امرتسر، جالندھر اور دہلی کے رفیوجی

کیمپوں کی خاک چھانتے پھرے۔ رفیوجی افسروں کی منت سماجت کی۔ مردوسارا بھائی مشن کے ساتھ بڑی بڑی امیدیں وابستہ کیے رہے۔ لیکن یہ سب کچھ بے سود ثابت ہوا۔ پھر آپ نے ان فہرستوں کو بھی دیکھنا چھوڑ دیا جو بازیافت شدہ عورتوں اور لڑکیوں کے بارے میں آئے دن اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں۔

میں خاموشی سے اس کی طرف تکتا رہا، وہ بار بار بہتی ہوئی ناک پونچھتی رہی۔ اس کے بالوں کی لٹیں بار بار اس کے چہرے پر دائیں بائیں اتر آتی تھیں، جنھیں وہ کانوں کے پیچھے جما دیتی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پڑیا تھی جسے وہ مٹھی میں دبائے ہوئے تھی۔

''لیجیے! میں آپ کی یہ حیرانی دور کیے دیتی ہوں کہ میں کون ہوں! آپ کے بارے میں اتنا کچھ کیوں کر جانتی ہوں۔ دس روز ہوئے، اس اسٹیشن پر رات کی آخری گاڑی سے ساندال والا گاؤں کا زمیندار ہزارہ سنگھ اترا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی نئی نویلی دلہن ریشم کور بھی تھی۔ چونکہ انھیں اتنی رات گئے یکہ تانگا نہیں مل سکا تھا اسی لیے انھوں نے وہ رات آپ کے کوارٹر میں گزاری تھی۔ ہزارہ سنگھ رات بھر شراب پیتا رہا تھا۔ اس نے آپ کو بھی شامل ہو جانے کی دعوت دی تھی لیکن آپ نے قبول نہیں کی تھی۔ اس نے آپ کو بتایا تھا کہ پہلا اسٹیشن ماسٹر تو اس کے ساتھ خوب کھاتا پیتا تھا۔ وہ بڑا رنگیلا اور موج میلے والا آدمی تھا۔ ہزارہ سنگھ آپ کی معصومیت پر زور زور سے ہنستا رہا تھا۔ آپ نے اس کے پاس بیٹھ کر بہت سی باتیں کی تھیں اور اسے اپنے سارے حالات بتا دیے تھے۔ میں پاس بیٹھی سنتی رہی تھی۔ آپ کا پورٹر اپنی ایک مرغی ذبح کر کے اور بھون کر لے آیا تھا اور اس کے عوض ہزارہ سنگھ سے دس روپے انعام میں پائے تھے اور تھوڑی سی شراب بھی، جسے لے کر وہ گاتا ہوا اپنے کوارٹر میں لوٹ گیا تھا۔

مجھے وہ اونچا اور مضبوط جسم والا سردار یاد آ گیا جس نے واقعی دس روز قبل میرے کوارٹر میں رات گزاری تھی۔ اس نے اپنے آپ کو ساندال والا زمیندار بتایا تھا۔ لیکن اس کا کلکتہ میں بھی بسوں کا کچھ کاروبار تھا۔ اس کے ساتھ گھونگھٹ میں چہرہ چھپائے ہوئے ایک عورت بھی تھی شاید اس کا ریشم کور ہی نام ہوگا! لیکن ان کا اور اس لڑکی کا آپس میں کیا رشتہ ہے جو میرے سامنے بیٹھی اس واقعے کی ایک ایک تفصیل بیان کر رہی ہے۔

''میں ریشم کور ہوں، میرے گھونگھٹ میں ہونے کی وجہ سے آپ مجھے نہیں دیکھ سکے

تھے اب میں نے وہ نقاب الٹ دی ہے جو گذشتہ پانچ سال سے میں اپنے چہرے پر ڈالے ہوئے تھی۔ میں سردار ہزارہ سنگھ کی بیاہتا دلہن نہیں تھی۔ اس نے زبردستی مجھے گھر میں ڈال رکھا تھا اور مجھے ریشم کور کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ میں اپنی مرضی کو بھول جاؤں لیکن میں کبھی ریشم کور نہ بن سکی۔ وہی فہمیدہ ہی رہی جو عمر دین اسکول ٹیچر کی بیٹی تھی۔''

سردار جی! آپ کی آنکھوں میں حیرانی بھری ہوئی ہے۔ شاید آپ کو یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ سب سچ ہو سکتا ہے۔ اب آپ یقین کر ہی لیجیے کہ میں ہی وہ ریشم کور تھی اور اب میں ہی وہ فہمیدہ ہوں۔ یہاں میں اپنے ابا سے ملنے آئی تھی۔ کلکتہ جیسے دور دراز مقام سے صرف اپنے ابا سے ملنے کے لیے، جو اس دنیا میں تھا ہی نہیں لیکن میں سمجھتی تھی کہ وہ پچھلے پانچ برس سے میرا انتظار کر رہا ہوگا ساندال والا میں۔''

ہزارہ سنگھ کو میں مجبور کر کے یہاں لے آئی تھی، وہ آنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس علاقے کے تھانیدار سے ڈرتا تھا مجھے کلکتہ جیسے شہر میں چھپائے رکھنے کے لیے وہ اسے کئی ہزار روپے کھلا چکا تھا لیکن وہ بہت لالچی تھا۔ بار بار اور طلب کرتا تھا اور دھمکی بھی دیتا رہتا تھا کہ وہ اس کی ریشم کور کو پاکستان بھجوا دے گا۔ اس لیے وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر کلکتہ میں جا کر بسوں کا بزنس کرنے لگا تھا۔ میں نے ہی اسے کہا تھا کہ مجھے ایک بار صرف میرے گاؤں لے چلو۔ وہاں میں ابا سے ملوں گی۔ آخری بار اسے اسکول کے میدان میں لڑکوں کو ڈرل کراتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے اسی میدان میں قتل کر دیا گیا تھا اور اس کی وہسل اس کے منہ میں ہی رہ گئی تھی۔ جب میں اس کے لیے کھانا لے کر وہاں پہنچی تھی تو اس نے لڑکوں سے زور زور سے کہا۔ مارچ! اور ننھے ننھے اسکول کے بچے لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے مارچ کرنے لگے تھے۔ میں اس وقت بھی اس کھیل کود کے میدان سے چلی آ رہی ہوں۔ وہاں جانے کا موقع مجھے آج ہی رات کو مل سکا۔ میں نے اس سنسان ماحول میں آج بھی اپنے ابا کی آواز سنی اور اس کی وہسل کی بھی۔ وہ آج بھی گھپ اندھیرے میں لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ کہتا پھرتا تھا۔ وہاں جا کر مجھے وہ منظر یاد آ گیا۔ وہ جگہ جہاں کبھی میرے قدم گڑے سے رہ گئے تھے، جہاں میرے ہاتھوں سے کھانے کا ڈبہ گر پڑا تھا جہاں ایک بھیانک منظر دیکھتے ہی میرے ہونٹوں سے چیخ نکل گئی تھی۔ جہاں میں نے اپنے پیارے ابا کے سینے میں ایک تیز چمکتی ہوئی تلوار کو دھنستے ہوئے دیکھا تھا اور جہاں میں نے بیشمار بچوں کو جن میں ہندو، سکھ اور

مسلمان سب ہی تھے ادھر ادھر گھبراتی ہوئی بھیڑوں کی طرح بھاگتے ہوئے دیکھا تھا اور جہاں سے اٹھا کر مجھے دو تگڑے سردار لے گئے تھے اور ایک کمرے میں لے جا کر بند کر دیا تھا۔ پھر وہاں سے مجھے کلکتہ لے جایا گیا تھا اور فہمیدہ سے ریشم کور بنا لیا گیا تھا۔ میں اسے کیسے بھول سکتی تھی جس کا ابھی ایک خواب پورا نہیں ہوا تھا۔''

فہمیدہ بے اختیار رو بھی پڑی۔ روتے روتے بولتی رہی'' آج میں نے اپنے ابا کو بہت آوازیں دیں۔ اسے بتایا کہ میں واپس آ گئی ہوں، آپ ہی سے ملنے کے لیے۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ لڑکوں کو پٹی کرانے میں لگا رہا۔ سردار جی! اگر میں آپ کو بھی ابا کہہ کر پکاروں تو آپ برا تو نہیں مانیں گے؟ آپ تو بھگونت اور کلونت کور کے دار جی ہیں۔ بھگونت، کلونت اور فہمیدہ ایک ہی قسم کی سیاست کا شکار ہوتی ہیں۔ اسلامی راج اور رام راج کا۔ دونوں ملکوں میں اغوا کی ہوئی عورتیں ایک مال غنیمت تصور کی جاتی ہیں۔ پولیس والے رشوتیں کھا کر چپ رہتے ہیں یہ مظلوم عورتیں بھی ان کی ناجائز کمائی کا ایک ذریعہ ہیں۔ وہ ہمیں اپنے اپنے دوزخ سے کب نکلنے دیں گے! لیکن آج میں نے اپنا انتقام لے لیا ہے۔ اتنے عرصے سے اسی موقع کی تلاش میں تھی کہ ایک مرتبہ وہاں پہنچ جاؤں جہاں سے اغوا کر لی گئی تھی اور جہاں ہزارہ سنگھ کے وہ سارے ساتھی رہتے ہیں جنھوں نے باری باری میری عصمت لوٹی تھی۔ آج.....''

آج کیا ہوا؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

وہ ہنس پڑی، عجیب وحشت سے۔'' آج میں نے ان سارے سور بیروں کو ہمیشہ کے لیے سلا دیا جنھوں نے بڑی بہادری سے مجھے فتح کیا تھا۔ دیکھئے میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ یہ وہی زہر ہے جو تھوڑا سا میں نے بچا لیا تھا۔''

''تم نے انتقام لے لیا۔ یہ اچھا کیا۔'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

''ہاں! ابا جی! مجھے آپ سے یہی امید تھی کہ آپ خفا نہیں ہوں گے، مجھے دھمکائیں گے نہیں، غصے میں بھر کر میرا گلا نہیں گھونٹ دیں گے۔''

''نہیں، ایسا ہرگز نہیں کر سکتا تھا، لیکن اب تم جاؤ گی کہاں؟''

''کہیں بھی نہیں، یہیں آپ کے پاس بیٹھ کر صبح کا انتظار کروں گی۔ جب پورے گاؤں

کو خبر ہو جائے گی اور وہ مجھے تلاش کرتے کرتے یہاں آ جائیں گے تو میں ان کے سامنے ہنستے ہنستے یہ پڑیا پھانک لوں گی۔ زندہ ان کے ہاتھ نہیں لگوں گی۔ ان کی نظروں کے سامنے پنکھ سے اڑ جاؤں گی۔

یہ کہہ کر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اگرچہ اس کے چہرے پر معصومیت تھی لیکن اس کے پیچھے ایک دل دہلا دینے والی وحشت بھی جھلک رہی تھی۔

میں نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ چار بجنے والے تھے گاڑی کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ پورٹر آتا ہوگا۔ میں نے کھڑکی کھول کر بھی دیکھا دور سے کوئی مسافر کھانستا ہوا چلا آ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے ٹکٹوں کی الماری کھولی۔ اور ایک ٹکٹ نکال کر مشین پر کھٹ سے اس پر آج کی تاریخ ڈال دی اور اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''کچھ منٹ کے بعد گاڑی آ رہی ہے جو تمھیں جالندھر لے جائے گی۔ وہاں جا کر تم پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر کے آفس چلی جانا، وہ تمھیں پاکستان بھجوا دے گا۔''

''میں پاکستان جا کر کیا کروں گی۔ وہاں میرا کوئی نہیں ہے۔ میرے سارے رشتے دار قتل کر دیے گئے تھے۔''

''لیکن تمھیں ابھی ایک اور ضروری کام کرنا ہے۔ تمھارے پاس جو زہر بچا ہوا ہے، اسے تم اپنے پاس محفوظ رکھو، جب وہاں جاؤ تو ایک شہر میانوالی میں چلی جانا۔ میانوالی کے ایک گاؤں روکھڑی کو پوچھتی ہوئی پہنچ جانا۔ وہاں بھی ایک زمیندار ہزارہ سنگھ رہتا ہے لیکن اس کا نام نور محمد ہے اس کی بہت بڑی حویلی ہے۔ اس میں میری دونوں معصوم بچیاں قید ہیں، یہ زہر انھیں کے حوالے کر دینا اور انھیں بتا دینا کہ تمھارا بدنصیب باپ اس ویران اسٹیشن پر تمھارا انتظار کر رہا ہے۔ تمھارے چلے جانے کے بعد میں ہر روز گاڑی پر ان کی واپسی کا انتظار کروں گا۔

او۔سی

اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کے سامنے چار اشخاص کھڑے تھے۔ سینئری انسپکٹر، کلیم انسپکٹر، ریلوے پروٹیکشن انسپکٹر اور اسٹیشن ماسٹر خود۔ اسٹیشن ماسٹر اور ریلوے پروٹیکشن انسپکٹر اپنی اپنی تازہ پریس شدہ وردی پہنے ہوئے تھے۔ باقی دو صاف ستھرے کپڑوں میں تھے۔ چاروں بے حد مضطرب تھے۔ ایک ہی سمت سب کی نگاہ جمی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم کے کونے پر، جہاں متوازی آہنی پٹری کی ایک شاخ ایک بند کونے کی طرف نکل گئی تھی۔ وہاں شنٹنگ انجن ایک چھوٹی، نئی نئی روغن کی ہوئی چار پہیوں کی آفیسرس کوچ کو آہستہ آہستہ ٹھوکر کے قریب لے جا رہا تھا۔ کوچ کے پیتل کے ہینڈل دھوپ میں چمک رہے تھے۔ فٹ بورڈوں پر نئے فٹ پیڈ لگے ہوئے تھے۔ فٹ بورڈوں کے قریب جہاں پہیے اور دوسرے بھاری کل پرزے لگے ہوئے تھے، وہاں سفید روغن کیا گیا تھا تاکہ اندھیرے میں بھی خطرے کی جھلک دکھائی دے جائے۔ وہ گاڑی ایک بڑے ریلوے افسر کی ریزرو کوچ تھی جسے عرف عام میں او۔سی بھی کہتے ہیں۔ او۔سی کے سب دروازے اور کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔

اسٹیشن ماسٹر اپنے کلین شیو چہرے پر سے بار بار پسینے کی نمی پونچھتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے ہم لوگ وہاں جا کر صاحب کو ریسیو کریں۔"

سینئری انسپکٹر نے رائے ظاہر کی۔ "میں سمجھتا ہوں کہ وہ ابھی اندر آرام فرمائیں گے۔

دس بجے سے پہلے باہر نہیں آئیں گے۔''

کلیم انسپکٹر نے بھی اس کی رائے کی تائید کی..... پروٹیکشن انسپکٹر خاموش رہا۔ ان سب کے چہرے غور سے دیکھ کر اپنی یونیفارم کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے بعد اپنے دفتر کی طرف گردن گھما کر دیکھا جس کے سامنے دو سینک بڑی مستعدی سے کھڑے تھے۔

اسٹیشن ماسٹر کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ متفق نہیں تھا۔ لیکن خود وہاں تنہا جانے کا فیصلہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک وہ اسٹیشن کے مختلف دفتروں کا معائنہ کرنے کے لیے چل پڑا کہ کہیں کوئی ایسی خامی نہ رہ گئی ہو جس کی وجہ سے اسے اپنے افسر کے سامنے جوابدہ ہونا پڑ جائے!

پہلے وہ سیدھا ٹکٹ گھر میں گیا۔ تین کلرک تین کھڑکیوں پر یونیفارم پہنے ہوئے مسافروں کو ٹکٹ بانٹنے میں مصروف تھے۔ ایک کلرک کے کوٹ کے کھلے ہوئے بٹن دیکھ کر اسے ڈانٹ دیا۔ اور ان کے انچارج کو تنبیہ کی کہ سب کام ٹھیک رہنا چاہیے! اَدھیڑ عمر انچارج کرسی پر سے ''یس سر'' کہتا ہوا اٹھا تو اس کی ننگی ٹانگیں دیکھ کر اسٹیشن ماسٹر حیران رہ گیا۔ حیران بھی اور غصے سے سرخ بھی! ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

اس نے بدن پر قمیص، کوٹ اور نیچے صرف انڈرویر پہن رکھا تھا۔ سیاہ لمبی ٹانگیں بالکل عریاں تھیں، بغیر پالش کے کھلے گھسے ہوئے بوٹوں کے اندر سردی سے کانپ رہی تھیں۔

''سرکار، مجھے پچھلے چار سال سے فل یونیفارم نہیں ملی۔ کتنی بار اسٹور کلرک کی شکایت کر چکا ہوں، کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔ میں نے فیصلہ کیا ہے آج ڈ۔سی۔ او صاحب کے سامنے اسی حالت میں جاؤں گا۔''

''یہ ڈسپلن کے خلاف ہے! ڈسمس کر دیے جاؤ گے، بتا دوں!''

''ٹھیک ہے میں محکمے کی غلطی کی بنا پر ڈسمس ہونے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے بعد عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا کر انصاف کرا لوں گا۔''

یہ سب دیکھ کر بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ ریل کے بابو بھی اور مسافر بھی۔ ایک پڑھے لکھے مسافر نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''آج میں بھی آپ لوگوں کے آفیسر سے ملوں گا۔ میں ریل کی بدانتظامیوں سے تنگ آ چکا ہوں۔''

اسٹیشن ماسٹر وہاں سے کھسک کر مسافر خانے میں گیا۔ ٹی اسٹالوں کی صفائی میں مین میخ نکالی۔ نالیوں اور کونوں کھدروں میں چونا پڑا ہوا نہ دیکھ کر سینٹری انسپکٹر کو بلا بھیجا۔ پھر قلیوں کے ٹھیکیدار سے مل کر اس بات کا اطمینان حاصل کیا کہ اسٹیشن کے احاطے میں کوئی قلی بلا نمبر اور بغیر وردی کے نہیں تھا۔ وہاں سے ہوتا ہوا وہ اپنے اسسٹنٹ کے پاس گیا جو اپنے دائیں بائیں بھاری بھاری کنٹرول مشینوں اور آگے میز پر پڑے کئی ٹیلیفونوں کے درمیان بیٹھا ہوا مسلسل بول رہا تھا۔ دو فونوں پر بیک وقت باتیں کر رہا تھا۔

''ہاں ہاں! چار نمبر سگنل ڈراپ کر دو۔ ہیلو! فور ڈاؤن پاس ہو گئی؟

ہیلو! یس یس! چھ نمبر خالی ہے! ہیلو! لائن کلیر بھیج رہا ہوں۔ ہیلو! ہیلو!!''

مسلسل کئی منٹ تک وہ اسٹیشن ماسٹر سے بات کرنے کی فرصت نہیں نکال سکا تو اسٹیشن ماسٹر باہر آ گیا۔ پلیٹ فارم کے آخری سرے پر پھر نگاہ جمائی وہاں او۔سی لگا دی جا چکی ہے۔ اس کے دروازے ابھی تک بند تھے۔ او۔سی کی جانب پلیٹ فارم پر گھومتے ہوئے کتنے ہی لوگ گھور رہے تھے۔

معاً اس کی نگاہ مس بھوشن پر پڑی۔ وہ ہاتھ میں کچھ کاغذات لیے او۔سی کی طرف جا رہی تھی۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور کوئی بات ہے! اسے بلانے کے لیے ایک پورٹر کو دوڑایا۔ وہ لوٹ کر آئی تو پوچھا..... ''کہاں جا رہی ہو؟''

''صاحب سے ملنے۔''

''کیوں؟''

جوان سانولے رنگ کی لمبے بالوں والی مس بھوشن نے کوئی جواب نہ دیا۔ بڑی بڑی گہری آنکھوں میں آنسو بھر لیے اور سر گھما کر ایک طرف دیکھنے لگی۔

''بتاؤ نا مس بھوشن! بات کیا ہے آخر؟''

''آپ کو معلوم ہے مجھے میرے ساتھی ٹکٹ کلکٹر کس قدر پریشان کرتے رہتے ہیں۔ ساتھی ہونے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ عورت کی کوئی عزت ہی نہیں ہے! یہ کہتے کہتے وہ بیچاری رو بھی دی۔

اسٹیشن ماسٹر گھبرا کر بولا۔ ''تمھیں سنگھ پریشان کرتا ہے نا! اسے تو میں نے ایک بار ڈانٹا

بھی تھا۔ کیا وہ ابھی تک باز نہیں آیا؟''

''یہاں سب پریشان کرتے ہیں۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک کیونکہ عورت جو ہوں! آج صاحب سے کچھ نہ کچھ فیصلہ کرا کے ہی رہوں گی۔''

اسی وقت وہاں ایک نوجوان وردی پوش کلرک آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک درخواست تھی۔ اسٹیشن ماسٹر کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب اس کو ذرا فارورڈ کر دیجیے۔''

''کیا ہے یہ؟''

''میرا پچھلے تین مہینوں سے کوارٹر کا کرایہ کٹ رہا ہے جبکہ میں اب کوارٹر میں رہتا بھی نہیں ہوں۔ کم تنخواہ ملنے کی وجہ سے میرے سر پر دو سو روپے کا قرض چڑھ چکا ہے۔ آج صاحب سے ملوں گا۔''

''تو تم سمجھتے ہو صاحب تمھیں اپنی جیب سے روپے نکال کر دے دیں گے!''

''وہ کچھ نہیں کریں گے تو ان کی او۔ سی کے آگے لیٹ جاؤں گا۔ اپنی بات منوائے بغیر انھیں یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔''

وہاں اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ اسٹیشن ماسٹر پیچھا چھڑاتے ہوئے بولا۔ ''ملو بھائی سب لوگ صاحب سے مل لو۔ میں کسی کو روک تھوڑی سکتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ وہاں سے کھسکا۔ پانی پلانے والے پورٹروں کو سخت نظروں سے گھورا جو ایک جگہ اکھٹے بیٹھے ہنس رہے تھے۔ خوانچے والوں کے خوانچوں کے اندر جھانک جھانک کر دیکھا جو اپنی چیزوں کو صاف کرنے اور چمکانے میں مصروف تھے۔ ان کی ریٹ لسٹ، لائسنس نمبر اور پہنی ہوئی وردی دیکھتا ہوا پان کی ایک گلوری کلے میں دباتا مال گودام کی طرف چل دیا۔ وہاں کا جائزہ لینا بھی ضروری تھا۔

مال گودام اسی طرف تھا جدھر آفیسر کی کوچ رکی ہوئی تھی۔ قریب پہنچ کر کوٹ کے سب بٹن بند کر لیے۔ ٹائی کی گانٹھ ٹھیک کی اور سر پر جمایا ہوا سفید ہیٹ بھی۔ کوچ کے کچن میں سے دھواں نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ صاحب کے لیے چائے تیار ہو رہی ہو گی! اس نے اندازہ لگایا۔ لیکن ابھی تک ان کا چپراسی یا باورچی باہر نہیں نکلا تھا۔ سب اندر مشغول ہوں گے!

او۔ سی کے سامنے جو بھی گزرتا تھا سانس روک لیتا۔ ہولے ہولے قدم رکھتا۔ کہیں او۔

سی کے اندران کے پاؤں کی چاپ نہ سنائی دے جائے۔ اسٹیشن ماسٹر بھی اسی انداز سے پنجوں کے بل چلتا ہوا سامنے سے گزر گیا۔ مال گودام کا جائزہ لینے کے بعد لوٹا تو اپنے ایک پورٹر کو او۔ سی کے سامنے ایک پانچ سال کا بچہ اٹھائے ہوئے دیکھا۔ خوب گورا چٹا۔ انگریزی فیشن کے سنہرے بال سفید کھدر کا کرتہ اور پائجامہ پہنے۔ لپک کر آہستہ سے سرگوشی میں پوچھا۔

''کیا صاحب کے بال بچے بھی ساتھ ہیں؟''

''جی یہ چھوٹے صاحب ابھی باہر آئے تو میرا جی چاہا انھیں اٹھالوں!''

''لاؤ میں اٹھاؤں اب تم بھاگ کر سکٹ لے آؤ۔ پورا پیکٹ لے آنا، کریم والے! میرا نام لے کر! سمجھے!''

''جی اچھا!''

بچہ اب اسٹیشن ماسٹر کی گود میں تھا۔

''ڈیڈی کیا کر رہے ہیں اندر؟ تمھارا نام کیا ہے؟ ہیلو بے بی!''

اتنا پیار کرنے اور پچکارنے پر بھی بچہ خاموش رہا۔ اسے بس گھورتا رہا۔ گود میں اٹھا لینے پر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اسٹیشن ماسٹر مسکراتا ہوا آہستہ آہستہ اپنے دفتر کی طرف بڑھا۔ جہاں اس کی گود میں بچہ دیکھ کر بہت سے لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔

اسٹیشن کا اسٹاف بہت عجیب تھا۔ آج ان کا اپنے کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار باہر نکل کر جمع ہونے لگتے تھے۔ جیسے کوئی تماشہ ہونے والا ہو۔ یا پہلے انھوں نے اپنے افسر کو کبھی دیکھا ہی نہ ہو!

اسٹیشن ماسٹر نے سب کو ڈانٹ دیا۔ جب پورٹر بسکٹ لے آیا تو سارا پیکٹ بچے کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا..... ''کھاؤ گے بے بی؟ کھول دوں؟''

بچے نے انکار کے طور پر سر ہلایا تو اس نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا اچھا! بے بی بہت اچھا ہے! اسے ڈیڈی اور ممی کے پاس لے جائے گا۔ ہیں نا..... چچ! لے جاؤ۔ جاؤ گے؟ اچھا چلو۔ بے بی کو او۔ سی کے پاس چھوڑ آئیں۔ ڈیڈی سے میرا سلام بولنا بے بی! سمجھے بے بی۔ کہنا..... اسٹیشن ماسٹر سلام بولتا ہے کہو گے نا؟

جو لوگ اپنی غلطیوں کی بنا پر خوفزدہ تھے وہ سامنے نہیں آ رہے تھے۔ دل ہی دل میں دعا

مانگتے پھرتے تھے کہ صاحب کا قدم ان کے دفتر میں نہ پڑے کسی طرح! جنھیں اپنی شکایات پیش کرنی تھیں وہ اسٹیشن ماسٹر کے پیچھے پیچھے او۔سی کی طرف جانے لگے۔ اسٹیشن ماسٹر کے منع کرنے پر بھی پیچھے پیچھے بڑھتے رہے۔

او۔سی کے عین سامنے ان کا ہجوم ہوگیا۔ ان کے بولنے کی آوازیں بھی اونچی ہوگئیں سب کے آگے اسٹیشن ماسٹر تھا۔ بچہ ابھی تک اس کی گود میں تھا۔

اچانک دروازے کا چمکتا ہوا ہینڈل ذرا سا ہلا۔ اسے دیکھ کر سب لوگ ایک ساتھ چونک گئے۔ خبردار ہوگئے۔ اپنے اپنے بٹن، پگڑیاں، ٹوپیاں اور ہیٹ سنبھالنے۔ پھر دم بخود ہو کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ کچن کی چمنی میں سے دھواں نکلنا بند ہو چکا تھا۔ صاحب نے چائے پی لی ہوگی۔! سب نے یہی سوچا اب وہ باہر آکر اسٹیشن کا معائنہ کریں گے۔ وہ بالکل غیر متوقع طور پر یہاں آگئے تھے۔ سال میں ایک آدھ بار ایسا ہوتا رہتا تھا۔ آج سب لوگ انھیں کوئی دوسرا کام نہیں کرنے دیں گے پہلے اپنی شکایات سنائیں گے۔ بہت سی شکایات.....وقت پر تنخواہ نہ ملنے کی، کوارٹروں کی، چھٹیوں کی، بیماریوں کی، زندگی کے بالکل لاچار، بالکل بے بس ہو جانے کی، جنھیں دور کرنا یا دور کر دینے کا جتن کرنا صاحب کے اختیار میں تھا۔

دروازے کا چمکتا ہوا سنہرا ہینڈل جو ایک بار حرکت کر کے ساکت ہو گیا تھا اب پھر ہلا۔ اندر سے ہولے ہولے کھانسنے اور چلنے کی آواز سنائی دی۔ سب لوگوں نے سانس روک لی۔ صرف دل زور زور سے دھڑک رہے تھے۔

دروازہ بھی ہلا۔ اندر کی طرف کھینچا گیا۔ پھر آدھا کھل گیا۔ اندر سے ایک باوردی چپراسی سرک کر، بہت احتیاط سے باہر آگیا۔ سب کی طرف گہری نظر سے تاکتا ہوا۔ صاحب کے ساتھ رہ کر اس نے ایسے ہجوم کئی بار دیکھے تھے۔ باہر آکر اس نے دروازہ پھر بند کر لیا تھا۔

''صاحب ابھی باہر نہیں آئیں گے؟''

اسٹیشن ماسٹر بچے کو اسی طرح اٹھائے اٹھائے چپراسی کے قریب گیا چپراسی نے اسٹیشن ماسٹر کی گود میں بچہ اٹھایا ہوا دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ مسکرا دیا اور اسے سلام کر کے بولا۔ ''حضور آپ نے بہت تکلیف کی! لائیے مجھے دے دیجیے اب!''

''نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ میری گود میں بہت خوش ہے بے بی۔ یہ بتاؤ صاحب کیا

کر رہے ہیں؟ کس وقت باہر آئیں گے؟'' اسٹیشن ماسٹر چاہتا تھا جس وقت صاحب باہر نکلیں وہ بچے کو اسی طرح اٹھائے ہوئے ہو۔

''صاحب!'' چپڑاسی کے چہرے پر قدرے حیرانی جھلکی۔ پھر مسکرا کر بولا ''صاحب تو نہیں ہیں اندر!''

''کیا صاحب اندر نہیں ہیں؟'' قریب قریب سب لوگ چیخ اٹھے۔

''جی نہیں وہ تو صبح ہی او۔ سی چھوڑ کر ایئر انڈیا سے آگرہ چلے گئے تھے، اپنے بال بچوں کے پاس۔ او۔ سی تو صرف آج کا بھتہ بنانے کے لیے چھوڑی گئی ہے۔''

اسٹیشن ماسٹر کے چہرے پر ایک گہرا اطمینان جھلکا۔ وہ بچے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''بے بی کو یہاں اکیلا کیوں چھوڑ گئے صاحب!''

''اسے؟'' چپراسی شرما کر مسکراتے ہوئے بول اٹھا..... ''یہ تو حضور آپ کا بچہ ہے!''

رام لعل کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے افسانوں کے ساتھ ناول بھی لکھے اور سفرنامے بھی، تنقیدی مضامین اور خاکے بھی لکھے اور ریڈیائی ڈرامے اور ادبی ڈائری بھی۔ وہ اگرچہ ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ تھے مگر جدیدیت کی طرف بھی میلان رکھتے تھے۔ ان کی مادری زبان اردو نہیں سرائیکی تھی مگر انھوں نے اردو کو اپنے تخلیق اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان کے فوری پیشروؤں میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، غلام عباس اور ممتاز مفتی جیسے بڑے اور رجحان ساز افسانہ نگار شامل تھے۔ ان کی موجودگی میں بحیثیت افسانہ نگار اپنی شناخت بنانا آسان نہیں تھا اور رام لعل نے اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 1945ء میں 'آئینے' کے نام سے شائع ہوا جس کا تعارف احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا۔ اس کے بعد ان کے افسانے ادب لطیف، ادبی دنیا، ساقی، نیرنگ خیال اور سب رس جیسے رسالوں میں شائع ہونے لگے۔ انھوں نے تقسیم ہند سے پیدا شدہ حالات پر بھی کئی کہانیاں لکھیں ہیں جن کی طرف زیادہ توجہ نہ دی جا سکی۔

رام لعل کا یہ مونوگراف ڈاکٹر مظہر محمود نے لکھا ہے۔ وہ دوردرشن کیندر لکھنؤ، ڈی ڈی نیوز، ڈی ڈی بھارتی، ڈی ڈی کسان اور سینٹرل پروڈکشن سینٹر سے بحیثیت پروگرام آفیسر وابستہ رہے ہیں۔ ان کے مضامین اور تراجم اردو، انگریزی اور ہندی کے اہم رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ''نیوٹرینڈس ان کمیونی کیشن تھیوری'' پر بھی انھوں نے تحقیقی کام کیا ہے۔

ISBN 978-93-5160-100-5
ISBN 935160100-5
9 789351 601005
NCPUL
New Delhi

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

₹ 105.00